نورنگی

ننگے

اچھی
کتاب
کا
نکھار
ہمیشہ
قائم
رہتا
ہے

نرگسے

صالحہ عابد حسین

آئینۂ ادب • چوک مینار انارکلی • لاہور

پاکستان میں، بار اوّل

۱۹۶۳

قیمت : دو روپے بارہ آنے

اہتمام : ــــــ م، ع، سلام
آئینۂ ادب
چوک مینار
انارکلی لاہور

مطبوعہ
نقوش پریس لاہور

نذرِ عقیدت

صدیقہ قدوائی

کے

نام

؎

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کی زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

صالحہ

فہرست

پیش لفظ

میرے افسانوں کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ نقشِ اوّل ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا۔ سازِ ہستی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی اور نراس میں آس ۱۹۴۸ء میں کتب پبلشرز نے چھاپا تھا۔ مگر کچھ ایسا ہوا کہ نقشِ اوّل کا پہلا نقش ہی نقشِ آخر بن گیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں سازِ ہستی کے تار ٹوٹ گئے اور نراس میں آس کی دوسری اشاعت کی آس نراس میں بدل گئی۔ اس سے چاہے یہ نتیجہ نکالئے کہ مصنّفہ کو کہانیاں لکھنی نہیں آتیں اس لئے وہ مقبول نہیں ہوئیں اور دوسری اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ چاہے اس حقیقت کو پا جایئے کہ اب اردو کے پبلشرز مختصر افسانے کے دلدادہ نہیں رہے بلکہ پہلے پہلے داستان (ناول) کے گرویدہ ہو چکے ہیں۔ کیسا ہی ناول ہو وہ چھپ جاتا ہے اور کسی پائے کے افسانے ہوں وہ پڑے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ ناول کا ہے۔ لوگ اب ناول پڑھنا ہی پسند کرتے ہیں۔ مختصر افسانہ کا دور ختم ہو چکا۔

لیکن دوسرے کتنی ہی بے رخی برتیں افسانہ نگار تو اپنی محبوب صنف سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ نہ رسالے ہی افسانہ سے بے رخی برت سکتے ہیں کہ اسی کے

بل پر تو وہ پڑھے جاتے ہیں ۔ چنانچہ ناول کی مقبولیت کے باوجود کم و بیش افسانہ نگار کہانیاں لکھتے رہے ہیں ۔ میرا شمار بھی ان ہی میں ہے ۔ ناول لکھنے کا مجھے بہت شوق ہے ۔ میرے تین ناول اب تک شائع ہو چکے ہیں ، اور پہلے دو کے کئی ایڈیشن بھی نکل چکے ہیں ۔ لیکن ناول جو فرصت ، جو کاوش جو مسلسل اجتماع خیال چاہتا ہے ۔ وہ ہمیشہ تو میسر نہیں آسکتا ؛ افسانہ کا پلاٹ ادیب کے دماغ میں کچھ اس طرح کوندجاتا ہے جیسے آسمان پہ بجلی یا شاعر کے ذہن میں شعر ۔ پھر پہلی فرصت میں ادیب اس کوندے اور تڑپ کو کہانی کے روپ میں ڈھال دیتا ہے ......

کہانی ایک شعر ہے ۔ ایک غزل ہے ۔ ناول ایک مسلسل نظم ہے ۔ نظم کے مقبول اور محبوب ہونے کے باوجود غزل کی چاہ لوگوں کے دل سے نہیں نکل سکی ۔ اسی طرح ناول کی مقبولیت کتنی بڑھے مختصر افسانے کی جگہ دلوں میں ہے اور رہے گی ۔

گذشتہ دس بارہ سال میں میں نے بھی بہت سے افسانے لکھے اور تقریباً سبھی اُردو کے اچھے رسالوں میں شائع ہوئے ۔ کچھ ریڈیو پر بھی نشر ہوئے کرمفرماؤں نے اکثر کہا کہ افسانوں کا نیا مجموعہ چھپواؤ ۔ مگر یادش بخیر ان مرحوم مجموعوں کی جواں مرگی یاد آ گئی اور نیا مجموعہ چھپوانے کو جی نہ چاہا ۔ لیکن پچھلے دنوں نہ صرف پڑھنے والوں کا اصرار بڑھا بلکہ دو تین پبلشرز حضرات نے بھی نئے افسانے چھاپنے کی خواہش ظاہر کی ۔ چنانچہ میں نے اپنے تقریباً چالیس افسانوں میں سے یہ نو کہانیاں اشاعت

کے لئے چھانٹ کر الگ کر لیں۔ جو کہانیاں خود میرے ہی معیار پہ پوری نہیں اتر رہی تھیں انھیں دوسروں کے سامنے پیش کرتی؟

یہ سب افسانے رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ شماتتِ ہمسایہ اور ماں رسالہ آج کل میں، مثلاً۔ علیگڑھ میگزین میں بابا اور ایک عالم ہے اسی رنگ میں رسالہ نیا دور میں شائع ہوئے تھے۔ ہمدرد حال ہی میں شمع میں چھپا ہے۔ ملے بھی تو کب ایک انعامی مقابلے میں تین سو روپے کا انعام حاصل کر چکا ہے۔ ایک کرم فرما رسالے نے بغیر میرے علم کے اس کا نام بدل کر اپنے ہاں شائع بھی کر دیا تھا۔ سہاگ رات سویٹ عورت میں چھپا ہے۔ خوشی کی چند گھڑیاں بھی کسی رسالے میں چھپ چکا ہے، نام اس وقت مجھے یاد نہیں۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے آخری الذکر افسانہ نشر بھی ہو چکا ہے۔

اور اب یہ تو افسانے رسالوں کی گھریلو پوشاک اتار کر اور کتاب کا رسمی لباس پہن کر منظرِ عام پہ آرہے ہیں۔ ادب نوازوں کی طرف مسکرا کر دیکھتے، نقادانِ فن سے جھجکتے اور محتسبوں سے ڈرتے ہوئے۔

صالحہ عابد حسین

۲۲ر اپریل ۵۹ء

شماتتِ ہمسایہ

"چور...... چور...... دَوڑو...... آؤ...... ارے دیکھئے تو یہ کون......"

اس نے نیم بے ہوشی میں یہ آوازیں سُنیں۔ آنکھیں کھولنی چاہیں مگر نہ کھل سکیں۔ سر اٹھانا چاہا پر وہ سیسے کی طرح بھاری تھا، بولنا چاہا مگر آواز گلے میں گھُٹ کر رہ گئی۔ وہ سمجھی یہ بھی اُن بہت سے بھیانک خوابوں میں سے ایک ہے جو وہ گزشتہ چوریوں کے بعد سے اکثر دیکھا کرتی ہے۔ اس کا کمزور جسم جو پچھلے مہینے بھر کی شدید بیماری سے اور بھی نحیف ہو چکا تھا۔ اور جسے آج پندرہ بیس راتوں کے بعد بہ مشکل دواؤں اور انجکشنوں کے ذریعہ سکون پہنچا کر سلایا گیا تھا، پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔

"ارے ارے۔ چچا ابا۔ دیکھئے تو بھابی جان کے بکس غائب ہیں"۔

ہتھوڑے کی ضرب کی طرح یہ آواز اس کے دماغ پر پڑی۔ اور اس کی ساری بے حس قوتیں ایک دم بیدار ہو گئیں۔

"کیا ہُوا؟ ارے کیا ہُوا؟ کیسے بکس۔ کس کے بکس؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ تم گھبراؤ نہیں آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"نہیں مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ کیا پھر چوری ہوگئی؟" اس کی آواز تھرا رہی تھی!

"چور آیا تھا چچی اماں۔ میں جاگ پڑی اور وہ بھاگ گیا!"

"چور؟ ..... کب آیا۔ کہاں سے؟ کیسے؟" ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملے بمشکل اس کی زبان سے نکل رہے تھے۔

"میں سو رہی تھی کہ کھٹ پٹ کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ سمجھی چوہے ہیں شکار کہ پھر سوگئی۔ ذرا دیر بعد پھر کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں پلنگ کے نیچے سے آئیں تو میں نے جمو کو جگا دیا۔ وہ اٹھی بھی نہیں تھی کہ میں نے اندھیرے میں دیکھا کہ کوئی چیز چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتی کمرے سے نکلی اور برآمدے میں جا کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ میں ننگے سر ننگے پیر اس کے پیچھے چچا ابا کو پکارتی نکلی لیکن اتنے میں چچا ابا باہر آئیں وہ منڈیر پر چڑھ کر نیچے پھاند چکا تھا۔"

"اے ہے تو اکیلی اس کے پیچھے لپک پڑی۔ ارے ڈر نہیں لگا بچی؟" ایک لمحے کے لئے سب کچھ بھول کر بڈھی ڈرپوک چچی جوان بھتیجی کی جرأت پر حیران رہ گئی۔

"ڈر کی کیا بات تھی چچی اماں۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے پاس اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے کھینچ مارتی ..... ہائے کاش اس وقت کچھ ہوتا میرے پاس" پھولے سانسوں سے بھتیجی چچی کو داستان سنا رہی تھی۔ اپنی ہمت پر انکسار آمیز فخر کے ساتھ۔

اور کچھ گیا تو نہیں ارے ہاں بکس ...... بکس غائب ہیں؟ ایک دم اُسے وہ جملہ یاد آ گیا جس نے اُسے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا! "بھابی جان کے جو دونوں بکس ہمارے کمرے میں رکھے تھے، وہ غائب ہیں۔ چچی اماں" رنج، پشیمانی اور درد کے ساتھ سر جھکا کر بھتیجی نے کہا۔

"ہے ہے میری بہو کا سامان چوری ہو گیا؟ ہائے اسے چار دن بھی اپنی چیزیں برتنی نصیب نہ ہوئیں"۔

"آپ لیٹ جائیے چچی اماں"

"اللہ غارت کرے ان کمبختی ماروں کو۔ میرا ہی گھر ان جھاڑو پھروں نے چوری کے لئے دیکھ لیا ہے"۔ اس کی آواز شدت گریہ سے رک گئی۔

"اری بی یہ تو بتاؤ کہ دلہن کے بکسوں میں تھا کیا؟ چوروں کی تلاش کے بعد باہر سے آتے ہوئے بڑے میاں نے پوچھا۔

"کہو کچھ کھوج ملا۔ چوروں کا ان کے ابا" اس نے بے قراری سے پوچھا!

"نہیں بی بھلا اس اندھیری رات میں کیا پتہ چلتا۔ ہاں تو بکسوں میں تھا کیا؟"

"کیا نہیں تھا؟ سبھی کچھ تھا۔ اس کے جہیز کے جوڑے، پہننے کے کپڑے، زیور۔ اس غریب کا تو سارا سامان اسی میں تھا۔ ہائے کیسی ساری چیزیں جھاڑو ماروں کے کلیجے میں گھس گئیں، اُن کے جھریوں بھرے گالوں پر آنسوؤں کی قطاریں

بہہ رہی تھیں۔

"خیر اب تم سو جاؤ کہیں زیادہ طبیعت خراب ہو گئی، تو اور مصیبت ہو گی اب صبح کو..... دیکھا جائے گا!"

دراصل بڑے میاں کی آنکھیں خود نیند سے جھکی پڑ رہی تھیں اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس چوری کے قصے کو اب رات بھر طول دیا جائے۔

"دیکھا کیا خاک جائے گا..... پہلے کی چوری کا کون سا پتہ چل گیا جو اب چلے گا" "کتنی راتوں کے بعد تو آج تمہیں اور اس کی وجہ سے ہمیں سونا ملا تھا کہ یہ مصیبت پڑ گئی۔ اب خدا کے لئے سو جاؤ۔۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، پتہ چل ہی جائے گا۔

"ہوں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور تم کچھ نہ کرو".....بڑبڑاتے ہوئے بڑی بی نے کہا۔ مگر نشہ آور دواؤں نے اپنا اثر کرنا شروع کر دیا تھا اس نے اپنا سر پھر تکیے پہ ڈال دیا۔ کچھ دیر سسکتی رہی اور پھر آنکھ لگ گئی۔

اور کس قدر تسکین اور مسرت ہوئی بڑی بی کو یہ معلوم کر کے کہ گیا کچھ بھی نہیں تھا۔ چور آئے ضرور تھے پر کچھ لے کر نہیں جا سکے وہ شکر آمیز آنسوؤں کے ساتھ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ ایک دم اس کے کان میں آواز آئی "جی ہاں رات چوروں نے پھر حملہ کیا امن کی دلہن کے دو بکس لے گئے۔ اس کی ماں کہتی ہیں کہ ان میں اس کا سب کپڑا زیور تھا!" خواب کا طلسم ٹوٹ گیا! بڑے میاں اپنے بھائی کو رات کی چوری کی تفصیلات سنا رہے تھے! تو یہ سب سچ تھا؟ پھر اب کیا ہو گا؟

کیسی چار دن کی دلہن ننگی بچی رہ گئی، ہائے وہ اُسے کیا مُنہ دکھائے گی۔ کیسے اس نقصان کی تلافی کرے گی! فکر، رنج اور غصّے سے اُس کا ضعیف دماغ کھول رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پڑوس کے دو.... نوجوان دونوں بکس جن کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے! اور کچھ بیکار کپڑے گودڑ کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے اُٹھا کر لائے۔

"اے بی دیکھنا۔ کیا گیا کیا رہا" بڑے میاں نے حسب عادت بیوی کو "اے بی" کہہ کر مخاطب کیا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی "کیا؟ کیا؟ سامان مل گیا؟ اللہ تیرا شکر"۔

مگر سامان دیکھ کر اُس کا دل بیٹھ گیا۔ سارے قیمتی عُمدہ، نئے جوڑے غائب تھے۔ دو تین دوپٹوں کا بھاری مسالہ نوچ کر اتار اگیا تھا اور دو پٹوں کی دھجیاں کر کے چھوڑ دی تھیں۔ زیور کا صندوقچہ ٹوٹا ہُوا، ویران پڑا تھا اُس کے ہاتھوں کا رعشہ اور زیادہ بڑھ گیا اور ہلتا ہُوا سر بمشکل اُس نے اُن سے تھاما "اب یہاں نہیں رہوں گی۔ ہرگز نہیں رہوں گی۔ دُنیا بھر کے چوروں کو بس میرا ہی گھر ملتا ہے"۔ نوجوان بیچاری بوڑھی کی حالت اور نقصان پر افسردہ و شرمندہ سے سر جھکائے کھڑے تھے اور وہ غصّے میں جانے کیا کیا بک رہی تھی۔ بغیر یہ سوچے کہ وہ جا کہاں سکتی ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر "ارے بی ذرا دیکھ تو لو کیا کیا چیزیں بچی ہیں"۔

"میں نہیں دیکھوں گی۔ مجھے نہ دکھاؤ یہ پھٹے چیتھڑے وہیں پھینک دو جاکر۔"
اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نئی دُلہن کی چیزوں کی یہ دُرگت واقعی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی!

اور پھر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا! دن بھر ملنے والوں، دوستوں، پڑوسیوں گاؤں والوں اور پولیس والوں کا ایک ہجوم تھا، یورش تھی اس کے گھر پر ۔۔۔ لوگ آتے، جس راستے سے چور اُوپر چڑھے تھے اُسے دیکھتے، تفصیلات پوچھتے، رائے زنی کرتے اور پھر بڑے میاں کے ہاں کی چوریوں پر مسرّت آمیز افسوس کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔ دل کے کسی کونے میں یک گونہ اطمینان کا احساس بھی موجود ہوتا۔ "چلو اسی گھر پر ٹلی۔ یہاں تو آیا ہی کرتے ہیں چور۔ شکر ہے ہمارا گھر تو خدا نے بچا لیا۔"

"ارے صاحب اس گھر میں روز روز چوری ہوا کرتی ہیں۔ خدا جانے کیا راز ہے۔"

"ایسے بے پروا لوگوں کے ہاں چوری نہ ہو گی تو اور کیا ہو گا۔ گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔"

"گھر میں دو بار پہلے چوری ہو چکی مگر بندوق کیسی ایک ڈنڈا تک نہیں، چوکیدار تک نہیں رکھتے!"

"خیر جی چوکیدار پر تو خرچ آتا ہے۔ پر کُتّا تو پال سکتے یہاں وہ بھی نہیں

میں نے تو سُنا ہے کہ پچھلی مرتبہ جن لوگوں کو پولیس نے پکڑا - ان حضرت نے خود سفارش کر کے اُن کو چھڑوا لیا کہ مجھے ان پر شک نہیں "

"اجی سنا کرو ایسی باتیں - ان کی سفارش پر بھلا پولیس چھوڑتی - جناب انھوں نے پانسو روپے رشوت بھری تھی ..... اسی لئے چھوٹ گئے "

"ابھی نہیں سُنا آپ نے ؟ بڑے میاں تھانیدار سے کیا کہہ رہے تھے ؟ مجھے تو کسی پر شبہ نہیں - میرا تو ملازم بھی ایمان دار ہے اور یہ پڑوسی چروا ہا بھی !"

"تو جناب ایسوں کے ہاں تو ایک دو بار نہیں سات بار بھی چوری ہو تو تعجب نہیں ہے "

چوری کی خبر سُن کر بڑے میاں کا لڑکا اپنی دُلہن کو لے کر پہنچا مگر بیوی کو کچھ نہیں بتایا کہ کہیں وہ رونا پیٹنا نہ شروع کر دے - وہ بیچاری تو بیمار پھوپھی کی جو اس کی چاہنے والی ساس بھی تھی ، مزاج پرسی کو آئی تھی - جب بڑی بی نے اُسے گلے لگا کر رونا شروع کیا تو اُن کی کمزوری و بیماری کے خیال سے اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے "آپ جلدی اچھی ہو جائیں گی پھوپھی اماں کیوں پریشان ہوتی ہیں !" اُسے کیا خبر تھی کہ وہ اپنی بیماری کو نہیں اُس کے نقصان کو رو رہی ہیں - لیکن جب روتے روتے بڑی بی نے کہا " میری بچّی تو ذرا سا غم نہ کیجیو - میں زندہ رہی تو تیری ایک ایک چیز بنوا کر چاہے دوں گی " تو اُس نے گھبرا کر میاں کی طرف دیکھا جو سر جھکائے پریشاں حال کھڑا تھا - مرد ہو کر رو رہا تھا ..... آخر تھا کس

ماں کا بیٹا —— وہ ایک لمحے میں سب کچھ سمجھ گئی - دل پر چوٹ لگی مگر اس نے پوری قوتِ ارادی کو کام میں لا کر اس صدمے کو دل کا دل ہی میں دبا دیا - اور بڑے مضبوط اور مطمئن لہجے میں بولی "پھوپی اماں - خدا کے لئے آپ صدمہ نہ کیجئے - آپ اچھی ہو جائیں - میرے لئے یہی بہت ہے - جب آپ موجود ہیں تو مجھے کیا غم" - اور اُس کے اُن پُر خلوص اور پر اعتماد الفاظ نے بڈھی ساس کے دل کو سنبھال لیا - اس کی محبت نے جیسے اُس کے سارے غم کی تلافی کر دی وہ زندہ رہی تو اس چاہنے والی سعادت مند بچی کا ذرا ذرا سا نقصان پورا کر دے گی - اور کوئی بہو ہوتی تو جانے کیا کیا کہتی - اس کے آنسو تھم گئے - غم ہلکا ہو گیا -

اور بڈھی بے صبر ساس بہو کے استقلال، ہمت اور صبر پر حیرت زدہ رہ گئی - وہ نہ روئی نہ گلہ شکوہ کیا، نہ غم غصّے کا اظہار، نہ چوروں کو کوسا اور گالیاں دیں - کہا تو یہ کہا "میری قسمت کا نہ تھا - شاید جو لے گئے وہ مجھ سے زیادہ اس کے مستحق اور ضرورت مند ہوں گے"

غریب ماں باپ کی غریب بچّی جسے کنوارے پن میں کبھی اچھا پہننا نصیب نہیں ہُوا - اور اس کا یہ استغنا! اس کی مردہ ماں کے زیور، مرحوم باپ کی نشانیاں اس کی محنت سے کشیدہ کی ہوئی چیزیں، سہیلیوں کے تحفے اور بری کے قیمتی جوڑے اور زیور سب چوری ہو گئے اور وہ یوں صبر شکر سے بیٹھی ہے، بچاری

بڑی بی کیا جانتی تھی کہ صبر اور استغنا رئیسوں کا نہیں غریبوں ہی کا شیوہ ہے دولت آدمی میں قناعت نہیں پیدا کرتی بلکہ لالچ اور ہوس بڑھاتی ہے۔

لیکن سب سے کٹھن وقت گھر والوں پر وہ پڑا ہے۔ اور سب سے زیادہ بڑی بی پر جب ہمدرد اور غمگسار بیویوں نے ماتم پرسی کے لئے آنا شروع کیا۔ گذشتہ واقعات کے بعد انہیں اس "تعزیت" کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اور اس ہمدردی کے خیال سے اُن کی رُوح لرز اُٹھی! لیکن غمگساروں کی ہمدردی کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ صبح سے شام اور صبح تک عزیز، غیر، پڑوسی، پڑ پڑوسی جان پہچان، انجان ہر قسم کی عورتوں کا تانتا بندھا رہا۔ ہر ایک کو موقع واردات دکھانا اور ساری تفصیل جزو کل سنانا، گھر والوں کا اخلاقی اور مذہبی فرض تھا۔ خواہ ہر بی بی کو اپنے گھر پر رتی رتی خبر مل چکی ہو۔ مگر وہ جب وہ تکلیف سہہ کر آئے تو گھر والوں سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ذراسی زبان ہلا کر سب باتیں ہی سنا ڈالتیں کس قاعدے یا اصول سے یہ بات مناسب ہوسکتی ہے؟ اگر بڑی بی یہ سمجھتی ہیں کہ مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ۔ یہ تو اُن کا غرور ہے یا حماقت دراصل بُھلا گئی ہیں وہ یہی تو ایک راحت مسرت باقی رہ گئی ہے۔ انسانوں کی اس دکھ بھری دنیا میں کہ سب دوسروں سے اپنا اپنا دکھ کہیں اور کسی کا سنیں نہیں!!

مگر بڑی بی کو کون سمجھائے۔ وہ تو غصے اور رنج! بیماری اور کمزوری سے

بے حال خاموش پڑی ہیں اسے الیسی بھی کیا کمزوری ہوگی! بس بڑھیا غرور کرتی ہے اور کچھ نہیں۔

اور دلہن اس طرح خاموش اور بے تعلق سی بیٹھی ہے جیسے اُس کا کچھ واسطہ نہیں۔ اس دلچسپ واقعہ سے، اور جمو؟ اس مُنہ پھٹ کے مُنہ کون لگے عجب اُکھڑے اُکھڑے جواب دیتی ہے۔ پر بانو، وہ تو ہیرو:ئن تھی! اس دلچسپ ڈرامے کی کیسے کھٹ پھٹ آواز ہوئی۔ اُس نے پہلے کیا سمجھا! کیا کہا پھر دوبارہ گڑبڑ سُنی۔ کیسے جمو کو جگایا۔ چور کس طرح پلنگ کے نیچے سے نکلا۔ یوں وہ جھپٹ کر اس کے پیچھے لپکی۔ اس نے چچا ابّا کو پکارا۔ کیسے چور دیوار پر چڑھ کر کودا۔ اس کا لباس کیسا تھا، قد کتنا تھا۔ رنگ کیا تھا! کپڑے کیسے پہنے تھا۔ اس ساری داستان کو پوری تفصیلات کے ساتھ ایک ایک بیوی کو سُنانا اس کا فرض تھا! بیویوں کی چہ میگوئیاں دلچسپ تھیں۔ کوئی دلہن سے اظہارِ خصوصیت و ہمدردی کر رہی تھی تو کسی کی باتوں پر نظرِ عنایت تھی کوئی بڑی بی پر حیرت زدہ تھی! تو کوئی بڑے میاں کی بڑھاپے کی نیند کے قصیدے پڑھ رہی تھی۔

"اے دلہن تم اپنا ذرا جی بھاری نہ کرو اللہ تمہارے وارث کو جیتا رکھے! سب کچھ پھر بن جائے گا!" ایک سسرال رشتہ دار نے سر پر ہاتھ پھیرا مگر پھر یہ دیکھ کر اس کو دھچکا سا لگا کہ دلہن مسکرا رہی ہے۔ آنکھوں میں آنسو تک نہیں "بیٹی سلامت رہیں تیرے بھائی پھر سب زیور بنوا دیں گے "تیرا" میکے کی

کی ایک عزیزہ نے بیٹی کی سسرال میں ناک اونچی کی۔

"ادئی بچی تو چور کے پیچھے بے دھڑک لپک پڑی۔ ڈر نہیں لگا۔ تو بہ یہ کیسا دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں کا" ایک صاحبہ نے بانو کی جراءت کی داد دی۔

"یہ بات کیا ہے کہ چور ہمیشہ تمھارے ہی گھر آتے ہیں"؟ گویا اس کی جوابدہی بھی گھر والوں پر فرض ہے۔

"میں تو بھئی حیران ہوں کہ کیسی نیند ہے ان لوگوں کی۔ چور آیا۔ سامان لے گیا اور تم سب پڑے سوتے رہے، یقین نہیں آتا" یعنی اس میں ضرور گھر والوں ہی کی کچھ سازش ہوگی۔

"واقعی حیرت ہے ہماری تو عقل کام نہیں کرتی۔ بھلا چور پلنگ کے نیچے سے بکس لے جائیں اور خبر نہ ہو" یعنی ضرور آنکھ کھلی ہوگی جان بوجھ کر چوروں کو موقع دیا گیا۔

"بچاری بڑی بی کو بڑا صدمہ ہے۔ بہو کے سامان جانے کا" بڑی بی کی ایک سہیلی نے صفائی دی۔

"ہونا ہی چاہیئے۔ پر چلو خیر اب کے ان کا سامان تو بچ گیا۔ بہو پہ ہی ٹلی" بہو کی ہمدرد نے آنکھ ماری۔

"وہ بچاری تو کل سے رو رہی ہیں، کہتی ہیں بہو کی ایک ایک چیز جب تک نہ بن جائے گی مجھے چین نہ ملے گا" سہیلی نے پھر وکالت کی۔

"اوئی وہ کاہے کو روتی ہیں کیا انہوں نے چوری کرا دی۔ یہ تو قسمت ہوئی"

ایک بیوی کو ساس بہو کی یہ محبّت بہت ناگوار گزر رہی تھی۔ اللہ ایسی دُنیا

پلٹ گئی کہ ساس بہو کی چیز کا افسوس کرے اور بہو ساس کو الزام نہ دے

کیا ہو گیا ہے اس زمانے کو؟

"مجھے کمال ہے۔ نیند ہے کہ غضب اتنا شور ہو اور گھر والوں کو خبر نہیں

ہوئی؟" ظاہر ہے کہ چور آتے ہیں تو خوب شور و غل کرتے آتے ہیں تا کہ گھر والے

سامان چھین کر انہیں پکڑ لیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔

"نیند کیا۔ یہ لوگ جاگتے ہوتے کب سُنتے ہیں، ابھی ہم آئے کتنی دیر کھٹکھٹاتے

رہے کسی نے سُنا ہی نہیں تبھی تو چوری ہوتی ہے"۔ فوراً آتی ہوئی ایک بیوی نے

گفتگو میں اپنا حصّہ ادا کیا۔

"اے یہ تمہاری چچی سدا کہا کریں ہیں کہ میری نیند یوں ہلکی ہے اور دل

ہلکی ہے۔ ذرا سے کھٹکے میں آنکھ کھل جاوے ہے۔ اور رات انہیں کچھ خبر

نہیں ہوئی؟" ظاہر ہے یا تو وہ جھوٹی ہیں یا چوروں سے ساز باز ہے۔

"اور ہم نے تو سُنا تھا کہ بڑی بی بہت بیمار ہیں۔ کئی راتوں سے نیند نہیں

آئی، ڈاکٹر حکیم دوڑ رہے ہیں، یا رات سب یوں گھوڑے بیچ کر سو گئے" گویا

جمو اور با[illegible] بار بار یہ بتانا کہ کل رات انہیں انجکشن کے ذریعہ سلایا گیا تھا۔

اس لئے دوسرے لوگ بھی تھکے ہارے سو گئے تھے بالکل بے معنی سی بات تھی

جس کا مطلب ہم ردوں کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔

"بہن تم نے ذرا غور سے صورت وضع قطع دیکھی ہوتی تو شناخت میں آسانی ہوتی" بانو کی ایک سہیلی نے فرمایا۔

"کیسے دیکھتی، ایک تو اندھیرا گھپ۔ روشنی چچی اماں کے کمرے میں رہتی ہے۔ پھر چور کی پیٹھ تھی میری طرف"۔

"تو تم نے لال ٹین اپنے کمرے میں کیوں نہیں رکھی"؟ گویا یہ تو معلوم ہی تھا کہ آج چور آئیں گے۔ لہٰذا! لال ٹین پاس رکھ کر سونا چاہیئے تھا!

"آخر چور آیا کدھر سے"؟ کئی مرتبہ کا پوچھا ہوا سوال پھر دُہرایا گیا۔

"کہا تو چھت پر سے۔ چور بلّی باندھ کر اُوپر چھت پر چڑھ آئے اور کمرے میں گھس کر بکس لے گئے۔

"تو آخر تم لوگ دروازہ بند کر کے کیوں نہیں سوتے ہو" یعنی چوروں کے ڈر سے زندگی بھر ہر شخص کو ہر کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے تیغہ ہو کر سونا ہی عقلمندی ہے۔

"خیر اب کیا کیا جائے۔ جو ہونا تھا ہو گیا! شاید اس میں بھی کوئی اللہ کی مصلحت ہو گی" ہر طرف کے حملوں سے گھبرا کر بانو نے کہا۔

"اُونھ، یہ بھی دل کو دھوکا دینا ہے بھلا چوری میں کیا مصلحت یا بہتری ہو سکتی ہے" بے شک دل کو سمجھانا دل کو دھوکا دینا ہے۔ اور صبر کا بہانہ ڈھونڈنا

فریب نفس اور حماقت ہے۔

"میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ پلنگوں کے نیچے بکس رکھے کیوں گئے تھے جو چوری گئے"۔ کسی دوسری جگہ سے تو لے جا ہی نہیں سکتے نا۔ انھیں خاتون نے پچھلی مرتبہ کی چوری کے وقت یہ قیمتی بات دریافت کی تھی کہ جب گھر والے اوپر سوئیں گے اور سامان نیچے کوٹھڑی میں بند رہے گا تو ضرور چوری ہو گی اس مرتبہ نئے زاویہ سے حملہ کیا گیا!

"اس بستی میں چوروں کا بہت زور ہے جب سے ہم یہاں آئے ہیں روز آدھی رات کو چور دروازہ بھڑ بھڑایا کرتے ہیں، پر ہم تو جاگتے رہتے ہیں۔ بہن۔ فوراً کوئی نہ کوئی بول اُٹھتا ہے اور وہ بھاگ جاتے ہیں۔ واقعی یہ تو چوروں کی پرانی عادت ہے کہ بڑے زور سے دروازہ بھڑ بھڑا کر اپنے آنے کا اعلان کیا کرتے ہیں۔

"یہی حال ہمارے ہاں ہے روز کواڑ بھڑ بھڑاتے ہیں۔ چور۔ آخر ایک دن ہمارے میاں نے غصہ سے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو ہم یہاں زیور روپیہ لے کر آئے ہیں، نہیں ہم کچھ نہیں لائے۔ بھلا ہم ایسے بے وقوف تھے کہ یہاں کچھ لے کر آتے"۔ یعنی تم بیوقوف لوگ ہی ہو کہ اپنے گھر میں اپنا سامان رکھتے ہو۔

"بس اُسی دن سے چور آنے کم ہو گئے تمھارے ہاں"

"کم کیا ہو گئے آئے ہی نہیں اس دن سے ظاہر ہے چوروں نے اُن کی صداقت

کا یقین کر لیا۔

جلی ہوئی جمو کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "چھوڑیئے ان باتوں کو ہمیں سے حماقت ہوئی ۔ ظاہر ہے چوری ہمارے ہاں ہوئی ہے ۔ اس لئے ملزم ہم ہی ہیں کہ جاگتے نہیں رہے ۔ چوروں کو پہچانا نہیں ۔ پکڑا نہیں ۔ سامان گھر پہ رکھا۔"

"بھئی یہ بڑے آدمی ہیں .... ان کے پاس سامان بہت سا ہے ۔ اسی لئے چور آتے ہیں لے جاتے ہیں ۔ اور ان لوگوں کو پرواہ بھی نہیں ہوتی ۔ ہم غریبوں کے ہاں جانتے ہیں کہ کیا لیں آکر ؟" ایک موٹی مرغی نے جو اپنا ہزاروں کا زیور بینک میں اور قیمتی کپڑا میکے میں رکھا کرتی تھیں رشک آمیز طنز فرمایا ۔

اے بہن سن رہی ہو ؟ اسی کو کہتے ہیں کسی کا گھر جلے کوئی تاپے جب قسمت ہیں نقصان ہونا ہو تو ہو جاتا ہے ۔ اب میرے ہاں اندر باہر بیاہ رہ بیس آدمی تھے ۔ اور چوری ہوئی تو کس صفائی سے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلا ۔ پر جو ہمدردی کرنے آیا الٹی ہمیں کو ملامت کی اور الزام دیا ۔ یہ حال ہے دنیا کا ۔" ایک چوری اور ہمدردی کی زخم خوردہ بیوی نے چپکے سے بڑی بی سے کہا ۔

"اری بہن جیسے تم لٹیں ویسے ہی میں بھی لٹ گئی ۔ تمہارے تو دو ہی بکس گئے میرے تو یہ بڑے بڑے آٹھ بکس تھے آٹھ ۔ بس یہ ہاتھ کی انگوٹھی بچی ۔" "اے تم تو ہنس رہی ہو ۔ میرا تو روتے روتے برا حال تھا ۔ کھانا پینا چھوٹ گیا ۔ بیمار پڑ گئی ۔ دیکھو یہ حال ہو گیا غم ہیں ۔" آٹھ بکسوں والی نے اپنا گدایا ہوا بازو بڑھا کر

دکھاتے ہوئے کہا۔

"آجکل کی لڑکیوں کو کس چیز کا درد نہیں، ارے وہ انہیں کی سہیلیاں ہیں۔ پچھلے جھگڑے میں لُٹ پٹ گئیں تھیں۔ ماں بچاری غم میں آدھی رہ گئی۔ پر وہ جب دیکھو ہنسی مذاق اڑاتی ملتی ہیں۔ کوئی فسادیوں کو بُرا کہے تو اُلٹی اس سے بحث کرنے لگتی ہیں عجب زمانہ ہے یہ بھی!" ظاہر ہے جو مصیبت پر ہنسے غم کو پیروں تلے کچلے اس سے کیا کوئی شریف آدمی ہمدردی کر سکتا ہے۔ ارے جب تک روپیٹ کر اظہارِ غم نہ کرو۔ کوسنے گالیاں نہ دو۔ کوئی تمہارے درد کو کیسے سمجھے گا؟

"ہم تو بھری بندوق رکھ کر سوتے ہیں۔ اور روزانہ رات کو ایک فیر کرا دیتے ہیں۔ بندوق رکھنی بہت ضروری ہے۔ یہاں" "لیکن جس کے پاس نہ ہو بندوق؟" "ہمارے ہاں تو بہن بندوق وندوق نہیں پر اللہ کے فضل سے چار مرد پانچ عورتیں سات بچے ہیں گھر میں۔" جس کے وہاں اتنے آدمی نہ ہوں اس کے تو چوری ہوگی ہی!

"ہم تو اکیلے میاں بیوی ہیں پر بیسیوں جانور پال رکھے ہیں۔ بڑی رونق اور آبادی ہوتی ہے جانوروں کی" "گھر والی کو جانوروں کا شوق نہیں اس سزا میں تو خدا نے چوری کرائی!" "چوروں کا کچھ آخر پتہ نشان بھی چلا کہ نہیں"؟ گویا پتہ چلتا تو آپ کی سی شرلاک ہومز ہستیوں سے چھپا بھی رہ سکتا تھا؟

"کہیں اپنے اس پڑوسی چودھری کو نہ پکڑوا دینا بچارا بڑا اچھا آدمی ہے"

پچھلی بار اس چرواہے کو پولیس کے پنجے سے چھڑانے پر انھیں خاتون نے سخت اعتراض کیا تھا۔

"اے بہن کسی پر اعتماد نہ کرنا.... یہ زمانہ برا ہے۔ نوکر اور پڑوسی ہی نہیں گھر والے تک بعض دفعہ ان چوروں سے مل جاتے ہیں"۔ بانو اور جمّو نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا! جمّو نے آہستہ سے بھاوج سے کہا "ہمیں ہی نہ پکڑوا دینا بھابی" بھاوج نے ہنس کر کہا "بانو باجی۔ تمھاری ہی تو سازش نہیں تھی چوروں سے"، اور تینوں لڑکیاں ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

اور بڑی بی لحاف کے اندر منہ دیئے بولنے سے مجبور، غصّے اور صدمے میں کھولتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنبھلی ہوئی طبیعت اس کوفت اور جلن سے اور زیادہ بگڑ گئی ؎ غم گساری ہائے دشمن کی شکایت کیجیے

یا بیاباں کیجیے پیاہن لذتِ آزارِ دوست

کتنے دن گذر گئے۔ جب کبھی بڑے میاں کے ہاں کی چوری کا ذکر آتا ہے تو ان کے غمگسار ہمسائے ہمسائیاں کہہ اٹھتے ہیں۔

"تعجب ہے کہ خبر نہیں ہوئی۔ اے پلنگ کے نیچے سے بکس اٹھ جائیں اور آنکھ نہ کھلے۔ یہ لوگ ہیں۔ ہی کچھ بے پرواہ اور..... نقصانِ مایہ ...... سہنا آسان ہے۔ پر شماتتِ ہمسایہ ــــ اُف .... خدا محفوظ رکھے!

ملاپ

سورج آہستہ آہستہ مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ رنگین بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور شفق کے رنگوں سے آپس میں ہولی کھیلتے معلوم ہوتے تھے۔ سرسبز درختوں کی قطاریں۔ آموں کے جھنڈ پھولوں کی بیلیں منظر کو اور بھی دل کشی بخش رہی تھیں۔ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ دور دور سے اڑتے ہوئے آتے اور گھونسلوں کے قریب آکر خوشی کی کلکاریاں مارتے بچھڑے بچوں سے محبّت کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں نے عذرا کے پیلے زرد چہرے کو ہلکے گلابی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ سفید ساری کا آنچل تیز ہوا سے پھریرے کی طرح لہرا رہا تھا۔ وہ انگلیوں کو بھینچ کر مٹھی باندھے ہاتھ کو جوش میں ہلا ہلا کر تقریر کر رہی تھی اور لوگ مسحور ہو کر سن رہے تھے۔

"ہاں ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ ابھی ہمیں آزادی کی جنگ جاری رکھنی ہے۔ پہلے ہم نے انگریزی سامراج کے ساتھ لڑائی لڑی تھی اب ہمیں ان دشمنوں

سے لڑنا ہے جو ہماری آزادی کا سچی آزادی بننے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ یاد رکھئے جب تک اس دیس کا ایک ایک آدمی بھوک اور افلاس سے جہالت اور بیکاری سے آزاد نہیں ہوجاتا اس وقت تک ہماری لڑائی جاری رہے گی۔ ہمیں دیس کے ہر فرد کو سچی آزادی دلانی ہے ..... تبھی ہم اپنے کو آزاد کہہ سکیں گے"۔

تالیوں کے شور کے درمیان عذرا ڈائس سے پسینہ پونچھتی ہوئی اتری۔ تھوڑے دن ہوئے وہ چھ مہینے کے بعد جیل سے رہا ہوئی تھی اور آج اس کے اعزاز میں یہ جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ وہ پنڈال سے باہر نکلی ہی تھی کہ ایک شخص نے تار کا زرد لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "آزاد کی حالت نازک ہے ..... فوراً آؤ ..... سلمان"

- - - - - - - - - - -

برسات کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے دلوں میں سے کہیں کہیں کوئی تارا ٹمٹماتا ہوا نظر آجاتا تھا۔ جیسے کسی بیکس کی امید کا چراغ جھلملا رہا ہو۔ درختوں کے جھنڈ میں کبھی کبھی جگنو دم بھر کو دمک کر اندھیرے میں چھید سا کردیتا تھا......

فرنٹیر میل اپنی پوری رفتار سے فرّاٹے بھرتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ انجن کے سامنے روشنی کا تیز دھارا تاریکی کے جنگل کو چیرتا ہوا راستہ بنا رہا تھا۔ تھرڈ کلاس کے درجے کے ایک ڈبے میں عذرا سیٹ پر پاؤں سکیڑے درجہ کی چوبی دیوار سے اپنی

پیٹھ لگائے جسمانی تکلیف سے بے نیاز آس پاس کے لوگوں سے بے خبر بیٹھی اپنے خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ کچھ مسافر بنچوں پر بیٹھے تھے کچھ اپنے بکسوں پر ٹک گئے تھے! چند خوش نصیب ایسے بھی تھے۔ جنھیں لیٹنے کی جگہ مل گئی تھی اور ریل کی چھک چھک نے انھیں لوری دے کر سلا دیا تھا۔

عذرا نے ایک اچٹتی نظر ڈبہ میں بیٹھے لیٹے اور کھڑے مسافروں پر ڈالی اور جھک کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اس کی لمبی لمبی سیاہ پلکیں نیند سے نہیں فکر و تردد سے بوجھل تھیں اور نیم وا آنکھیں سنسان اندھیرے کی سطح پر ماضی کے نقوش ابھرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان مٹے نقش جو پچھلے سال ڈیڑھ سال کی دن رات کی مصروفیت اور جدّوجہد کے دوران میں کچھ دھندلے پڑ گئے تھے مگر آج آنسوؤں کے ایک ہی چھینٹے نے انھیں دھو دھلا کر نکھار دیا تھا! کتنے واضح نقش کتنی صاف تصویریں۔

- - - - - - - - - - - -

وہ اپنی بھری بھری صندلی باہیں پھیلائے، آنکھیں بند کیے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لیے فرش پر پالتی مارے بیٹھی کہہ رہی ہے "آنکھیں بھیچیں کون آئے۔ کون آئے .... ابا آئے کہ بٹیا آئے" گول مٹول ہنس مکھ پیارا پیارا آزاد اپنی ننھی ننھی ٹانگوں سے دوڑنے کی کوشش کرتا ہوا اور سبک اندام کشیدہ قامت سلیمان دوڑنے کا بہانا کرتا ہوا دونوں عذرا کی طرف بڑھتے ہیں۔ آزاد جیت جاتا ہے اور اپنی باہیں

ماں کی پتلی گردن میں ڈال کر زور زور سے لپٹ جاتا ہے اور کنکھیوں سے باپ کی طرف دیکھ کر شرارت بھری آواز میں کہتا ہے "اماں ہمالی ابا کی نائن....."
سلمان عذرا کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور یہ مسکراہٹ جیسے اس کی شخصیت میں او رنکھار پیدا کر دیتی ہے...... عذرا بھی مسکراتی ہے۔

سلمان کہتا ہے "یہ شیطان تو میرا رقیب ہی بن گیا"۔ اور اپنا ایک بازو عذرا کی گردن میں حمائل کر کے بیٹے کا منہ چڑاتا ہے "اماں ہمالی..... بیٹے کی نائین" آزاد ننھا سا لال لال ہونٹ نکال لیتا ہے منہ بسورتا ہے ایک مکا سلیمان کے بازو پر پڑتا ہے "اماں...... دیکھو.... ابا...... ماننے نائین..... اور رونے کی تیاری کرنے لگتا ہے۔ کہ ماں بیٹے کو سینے سے لپٹا کر کہتی ہے" نا۔ نا۔ میرے لال رو نہیں...... اماں تو اپنے بیٹے کی ہے"۔ اور تینوں کھکھلا کر ہنس پڑتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ساری دنیا.... ساری کائنات ہنس پڑتی ہے۔

اور دم بھر میں یہ حسین منظر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور جیل کی تنگ و تاریک، بدبودار کوٹھری، اس کی سرد اور سخت زمین، وارڈن کا کرخت چہرہ، سپاہیوں کی بے حس نظریں۔ بھوک ہڑتال اور قید تنہائی سب اس کی آنکھوں میں پھر گئے..... چھ مہینے اس نے اس بندی خانے میں گھٹ گھٹ کر کاٹے تھے۔ گھنے چنے اُبلی دال اور ریت ملے آٹے کی روٹیاں حلق سے اتاری تھیں

اور جب کبھی غصّے سے ابل پڑی تھی تو اس کی سزا بھگتی تھی! وہ احتجاج کرتی نعرے لگاتی، لڑتی جھگڑتی رہی اور سزا پاتی رہی۔ اس طرح یہ طویل سرد اور بے کیف دن کٹے اور اب وہ قید سے چھوٹ کر ذرا آرام بھی تو نہ لے پائی تھی کہ اس کے پیارے بچّے کی بیماری کی خبر نے اس کے دل کو ہلا دیا۔ اس کے کڑے بے لوچ اصولوں کی جڑیں ہلا دیں۔ اور اب وُہ دوڑی جا رہی ہے اپنے بچّے سے ملنے کے لئے اسی بچّے سے جس کو وُہ سمجھتی تھیں کہ اس نے بھلا دیا ہے۔ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے..... مگر یہ غلط تھا..... دھوکا تھا۔ صرف بچّے ہی کی نہیں اس کے خود پرست باپ کی یاد بھی راکھ میں دبی چنگاری کی طرح اُس کے دل کے الاؤ میں چھپی ہوئی تھی! عذرا کے چہرے پر سے نفرت، بیزاری اور سختی کے پردے ایک کے بعد ایک اُٹھتے جا رہے تھے۔ اور نرمی شیرینی اور درد کے دل کش رنگ چہرے پر کھل اُٹھے تھے!

"محبّت ———— محبّت ———— محبّت"

دل کی ٹک ٹک کے ساتھ ساتھ یہ لفظ اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا! تلخ حقیقتیں دماغ سے محو ہوتی جا رہی تھیں —— اور وہ بارہ برس پہلے کی حسین و رنگین فضاؤں میں اُڑ رہی تھی! جب شادی کے بعد سلمان کی صورت میں اس نے اپنے سپنوں کے راجہ کے درشن کئے تھے"۔

— — — — — — — — — —

آہ ..... والہانہ عشق و محبت کی وہ حسین دُنیا، وہ صلح میں جنگ اور جنگ میں صلح کے مزے، وہ وصل میں جدائی کا دھڑکا اور جدائی میں وصل کی شیریں اُمید۔ سلمان کا عذرا پر دن رات پروانہ وار نثار رہنا اور عذرا کا سلمان کی پرستش کرنا۔ اس کی ہر بات ہر خیال ہر رائے کو عقیدت اور محویت سے سُننا اور دل و جان سے اس کی پیروی کرنا۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی، غم کا کوئی کانٹا نہ تھا۔ فکر کی خلش نہ تھی .... مخالفت اور نفرت کا زہر نہ تھا۔ بدگمانی کی تلخی نہ تھی۔ بہار ہی بہار تھی۔ ہاں اس گلشن عیش میں ایک ذرا سی خلش اس کے دل میں ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک جیتے جاگتے ننھّے مُنّے کھلونے کی آرزو۔ جسے اس نے بچپن میں گڑیوں کے روپ میں دیکھا تھا اور جس کی موہنی مورت اب راتوں کو سپنے میں اس کے سینے سے آ کر چمٹ جاتی تھی!

دیوار کے تختے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے عذرا جانے کتنی دیر سے بے حس و حرکت بیٹھی تھی جیسے سو رہی ہو — لیکن ہونٹوں پہ کھیلتی ہوئی دلآویز مسکراہٹ چغلی کھا رہی تھی کہ وہ سو نہیں رہی بلکہ تخیّل کی اس وادی کی سیر کر رہی ہے جو کبھی اس کی زندگی کی ٹھوس حقیقت تھی۔

اس کی تمنّا بر آگئی — اسے ایک پھول سا حسین بچّہ خدا نے عنایت کر دیا۔ ماں باپ کی مسرّت کی حد نہ تھی۔ بچّے کا نام آزاد رکھا گیا۔ اس تمنّا کے

ساتھ کہ اس بڑے آدمی کا ہم نام ہو کر ہمارا بچّہ بھی دیس کی خدمت کرے گا اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے تن من کی بازی لگائے گا..... آہ کیا کیا منصوبے بنایا کرتے تھے وہ دونوں اپنے بچّے کے مستقبل کے لئے۔

مگر بچّے کی پیدائش کے بعد ہی زمانے کی گردش نے بھی ان کا دامن تھاما سلمان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور اب سلمان پر اپنی ننھّی سی گھرہستی جلانے کے ساتھ ساتھ دوسرے عزیزوں کا بار بھی آپڑا۔ تھوڑی سی آمدنی، جنگ کا زمانہ، غضب کی مہنگائی اور جوانی کا پرارمان دور اور پھر بچّے کی ھزاروں ضرورتیں عذرا بہت کوشش کرتی کہ اپنی خواہشوں کا اظہار نہ ہونے دے اور کفایت اور سلیقے سے گھر کا خرچ چلائے لیکن کسی طرح بھی تو خرچہ پورا نہ ہوتا تھا اور پھر اپنی ضرورتوں کو آدمی روک لے بچّے کی ضرورتیں کہاں تک رد کی جاسکتی ہیں؟ اس کا تو دل چاہتا تھا کہ سارے جہاں کی نعمتیں لاکر اپنے بچّے پر نچھاور کردے، اور حال یہ تھا کہ پیٹ بھر دودھ اور کافی کپڑا بھی وہ اس کے لئے فراہم نہ کرسکتی تھی، کبھی کبھی وہ رو پڑتی کبھی جھنجلا جاتی! سلمان کو اس سے زیادہ اپنی ناداری کا احساس تھا۔ وہ چاہتا تو جنگ میں شریک ہوکر کوئی اچھا عہدہ حاصل کرسکتا تھا۔ مگر وہ آزادئ وطن کا مجاہد تھا! وہ ہندوستان کے بے ہتھیاروں (عدم تشدد) کی جنگ لڑ رہا تھا جس کے ذریعہ اس کا عقیدہ تھا کہ اس کے دیس کو آزادی نصیب ہوگی.....

وہ ایک اخبار میں کام کرتا تھا - دن رات محنت کرتا - پھر بھی اتنا پیسہ نہ کما سکتا تھا کہ اپنے خاندان کی کفالت کر سکے! وہ عذرا کے دل کی حالت اور جذبات کو سمجھتا تھا اور زیادہ سے زیادہ محنت کرتا تھا پھر بھی کسی طرح پوری نہ پڑتی تھی - عذرا کبھی کبھی اس سے اُلجھ جاتی۔

تم تو کہتے تھے کہ اگلے مہینے آزاد کے لئے ضرور گرم کپڑے بنوادوگے؟ وہ افسردگی سے کہتا "میں تو جو کچھ کماتا ہوں تم ہی کو دے دیتا ہوں ایک پیسے کی ضرورت ہو وہ بھی تم سے لیتا ہوں" —— عذرا لاجواب ہوکر اور بھی تنک جاتی "تو اتنے کم روپیوں میں کیسے میں یہ سب خرچ پورے کر سکتی ہوں میرا پھول سا بچہ سردی میں کملایا جا رہا ہے - اور میں اس کے لئے گرم کوٹ تک نہیں بنوا سکتی" - اور یہ کہتے کہتے وہ رو پڑتی اور سلمان اس کو اپنے سینے سے لگا لیتا "میری جان —— میں کیا کروں —— دیکھو دن رات محنت کرتا ہوں پھر بھی تم لوگوں کی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا - یہ غلام ہندوستان ہے - جہاں ایک ادیب ایک صحافی دن رات خون پسینہ ایک کرکے بھی اپنے بال بچوں کو نہیں پال سکتا - جب ہمارا دیس آزاد ہو جائے گا پیاری —— تو یہ سب مصیبت نہ رہے گی —" اور پھر وہ دونوں اس حسین آنے والے زمانے کے تصور میں کھو جاتے - جب ان کا دیس آزاد ہوگا اور خوشحالی و ترقی کی دولت سے مالا مال علم و عمل سے بھرپور —— آزاد ہندوستان ——

سلمان دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو عذرا مسکرا کے ہنستے ہوئے چہرے اس کا استقبال کرتی اور وہ دن بھر کی محنت اور کوفت کو بھول جاتا! فرصت کے وقت میں دونوں گھنٹوں ادب اور سیاست پر باتیں کرتے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ سلمان باتیں کرتا اور عذرا سنتی۔ اسے ادب سے اس لئے دلچسپی تھی کہ اس میں اسے اپنے دلی جذبات کا عکس نظر آتا تھا اور سیاست سے اس لئے کہ اس کا اثر اس کی گھریلو زندگی پر پڑتا تھا۔ وہ اس وقت عورت کی دنیا صرف گھرداری کے فرائض، شوہر کی خدمت اور رفاقت، بچے کی پرورش اور تربیت تک ہی محدود سمجھتی۔ اور اپنی اس دنیا میں خوش اور مگن تھی۔

- - - - - - - - - -

کوئی اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ ٹرین نے پٹری بدلی۔ ایک جھٹکا لگا اور عذرا نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور کھڑکیوں میں سے ان روشنیوں کو دیکھنے لگی جو دور سے تاریکی کے سمندر میں تیرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ایسے ہی جیسے اس کے حال میں ماضی کی چمکدار یادیں اُبھر رہی تھیں۔

کیا زمانہ تھا وہ بھی — سلمان اس کا دلدادہ، ہم خیال، ہم مذاق اور ہم راز تھا۔ مگر وہ اس عذرا کا عاشق تھا! جس کی اپنی نہ کوئی رائے تھی نہ الگ شخصیت تھی! نہ کوئی اصول تھا۔ نہ عملی جدوجہد.... عذرا کیا تھی اس وقت؟ سلمان کی آواز بازگشت — ہاں وہ اس عذرا کا سودائی تھا.... عذرا

بدلی تو وہ بھی بدل گیا۔

اس کی زندگی کا یہ پلٹا بھی کیسا اچانک آ گیا تھا! اور عذرا کی نظروں میں ۱۹۴۲ء کا طوفان بھر گیا۔ جب برطانوی سامراج کی پوری طاقت تحریک آزادی کو کچلنے پر تل گئی تھی۔ جب دیس میں اس سرے سے اس سرے تک عمل اور پاداش عمل کا ایک چکر چل رہا تھا۔ جب سارے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ہزاروں کارکنوں اور لاکھوں عوام کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ جب ملک اپنی آزادی کی آخری جدوجہد کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دے رہا تھا اور ہر طرح کے مصائب برداشت کر رہا تھا ـــــ ان لاکھوں مجاہدوں میں سے ایک سلمان بھی تھا جسے آزادی کی خدمت کے جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

عذرا کی پرسکون دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ کوئی ان کا بوجھ اٹھانے والا نہ رہا اور وہ مجبوراً اپنے بھائی کے پاس ایک دوسرے بڑے شہر چلی گئی۔ وہاں اسے ایک نئی دنیا نظر آئی۔ وسیع انوکھی دنیا۔ عمل اور جدوجہد کی دنیا اسے بہت سے لوگوں سے واقفیت ہوئی۔ اب سلمان کے سہارے چلنے اور اس کے دماغ سے سوچنے کی عادت چھوٹنے لگی۔ خود ہر بات پر غور کرتی۔ اور خود فیصلہ کرتی۔ صدمے، غصہ اور بے بسی کے احساس سے جو لاوا اندر ہی اندر کھول رہا تھا آخر اسے باہر نکلنے کا راستہ مل ہی گیا! عذرا نے اپنے کو آزادی کی بھٹی میں جھونک دیا۔ وہ انقلابیوں کی

ساتھی بن گئی جو تشدد کے ذریعے اپنے دیس کو بدیسی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے! وہ یہ جانتی تھی کہ مسلمان عدم تشدد کا پابند ہے۔ مگر اسے اس وقت کوئی اور راہ اس کے سوا نظر نہ آئی۔ بدیسی حکومت نے اس کے وارنٹ گرفتاری نکال دیئے۔ اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ انڈر گراونڈ ہو گئی۔ پر خلوص، پرجوش اور انتھک محنت کرنے والے کارکن کی حیثیت سے اس کے ہم خیال اس کی بڑی قدر و عزت کرنے لگے اور خود اسے بھی اپنی اہمیت اور خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا۔

عذرا نے باہر گھنے جنگل پر نظر ڈالی۔ تو وہ سارا زمانہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا جو اس نے جنگلوں میں چھپ کر گذارا تھا اور وہ سب دکھ جو اسے اور اس کے بچے کو جھیلنے پڑے تھے۔ کس کس طرح وہ خفیہ پولیس کے پنجہ سے خود کو بچاتی تھی! جو شکاری کتوں کی طرح اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ اکثر وہ جنگل ہی میں رات بسر کرتی! اور رات بھر شیر کے دھاڑنے اور بھیڑیوں کے بولنے کی آوازیں سن سن کر بچے کو چھاتی سے لگائے بیٹھی رہتی... کبھی کبھی کوئی ٹوٹی پھوٹی اجاڑ جھونپڑی یا کسی سادھو کی کٹی اسے پناہ دیتی۔ ... میلوں پیدل چلنا پڑتا ..... پاؤں میں چھالے پڑ جاتے۔ کانٹے چبھتے اور پتھروں کے چبھنے سے پاؤں لہو لہان ہو جاتے۔ اکثر فاقہ کرنا پڑتا۔ یا جنگلی پھول پھل پہ گذارا کرتی .... بچے کو ہفتوں دودھ تک نصیب نہ ہوتا۔ ایک

مرتبہ تو اس کے لال کو سانپ نے کاٹ لیا... وہ تو خیر ہوئی کہ سانپ زہریلا نہ تھا اور جھاڑ پھونک کے بہانے بچّہ بچ گیا۔

اور آخر... جیسے تیسے فراق کا یہ زمانہ بیت گیا ...... ۱۹۴۵ء میں دوسرے لوگوں کے ساتھ سلمان بھی قید سے چھوڑ دیا گیا۔ آہ کیا حال ہو گیا تھا اس کے سُرخ سفید تندرست سلمان کا۔ اسے دیکھ کر.... ذرا دیر کے لئے تو وہ سکتے میں رہ گئی تھی۔

اگرچہ عذرا کا جی نہ چاہتا تھا کہ یہ جگہ چھوڑ کر جائے جہاں اس نے اتنا کام کیا تھا اور ابھی بہت کچھ اور کرنا چاہتی تھی مگر سلمان کے خیال سے اس کے ساتھ پھر اُسی چھوٹے سے شہر میں جانا پڑا۔ اور زندگی کی گاڑی پھر اپنے پُرانے ڈھرّے پر چلنے لگی۔

— — — — — — —

پہلے پہل تو سلمان عذرا کی نئی شخصیت سے بڑا مرعوب اور خوش ہوا۔ وہ اس کے عزم اور حوصلہ کو سراہتا، اس کے کارناموں کو حیرت اور احترام کے ساتھ سُنتا اس پر فخر کرتا۔ جیسے عذرا کے کارناموں کا سہرا خود اسی کے سر ہو۔ اور عذرا دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ سلمان اب اس کی پہلے سے زیادہ عزت کرتا ہے۔ اُسے گڑیا نہیں عورت سمجھتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے لیکن تھوڑے دن بعد ہی دونوں میں مخالفت شروع ہو گئی۔ اطاعت شعار بیوی

کا عادی مرد خود دار ہے۔ خود سر عورت سے گھبرا اُٹھا۔ عذرا کی سیاسی سرگرمیاں سلمان کو ذرا نہ بھاتیں۔ مگر کرتا کیا؟ وہ عورت کی آزادی کا علمبردار رہ چکا تھا۔ اب کیسے منع کرے کہ تم سیاست میں حصّہ نہ لو۔ اور منع کرے بھی تو سنتی کب تھی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ اب گھر کے کام اور بچّے کی پرورش میں عذرا کو پہلے جیسا انہماک نہ رہا تھا کبھی جھنجھلا کر وہ کہہ بھی دیتا "عذرا کیا مصیبت ہے" کھانا کبھی وقت پر نہیں ملتا اور جو ملتا ہے وہ بھی بدمزہ"۔

وہ جواب دیتی "پھر میں کیا کروں؟ میری بھی تو آخر مصروفیتیں ہیں۔ دن بھر چکّی چولہا ہی تو نہیں کر سکتی۔ دیر ہو جایا کرے تو خود ہی پکا لیا کرو"۔

وہ بگڑ جاتا "پہلے تو میری عادت خراب کی کہ کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیتی تھیں اب کہتی ہو کہ پکا بھی خود ہی لیا کرو"۔

عذرا ہلکے سے طنز سے جواب دیتی "بگڑی عادت سنور بھی تو سکتی ہے" اور سلمان اندر ہی اندر غصّہ سے کھولتا ہُوا باہر چلا جاتا۔ بچّے کی حالت دیکھ کر وہ سب سے زیادہ کڑھتا تھا۔ بار بار بیوی سے کہتا کہ دیکھو آزاد کی صحت اچھی نہیں۔ اس کی تربیت بھی ٹھیک نہیں ہو رہی۔ تمہیں چاہیئے کہ اس کا زیادہ خیال کرو۔ زیادہ وقت اُسے دو"۔ مگر عذرا کو تو نیا نیا اپنی طاقت اور آزادی کا نشہ چڑھا تھا۔ وہ سمجھتی کہ سلمان محض اسے ستانے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ وہ بے پروائی سے کہتی "بچّہ میرا اکیلے کا تو ہے

نہیں جتنا فرض میرا ہے اتنا ہی تمہارا بھی ہے۔ تم خود اس کا خیال کیوں نہیں رکھتے!" یہ سُن کر سلمان بھڑک جاتا" تو کیا اب میں بیٹھ کر بچے پالوں گا۔" عذرا طنز کا ایک اور نشتر چلاتی "کیوں کیا بچے پالنے سے مردانگی میں بٹا لگ جاتا ہے"۔ غرض وہ پہلے والی پرسکون نرم رو ندی کی سی زندگی ختم ہو چکی تھی بلکہ اس کی جگہ ایک تیز بہنے والے دریا نے لے لی تھی۔ جس میں روز چھوٹے موٹے طوفان آتے رہتے تھے۔ مگر پھر بھی شدید مخالفت کی نوبت نہ آتی ذرا دیر جھگڑا رہتا پھر دونوں تھوڑا تھوڑا جھکتے اور گھل مل جاتے

عذرا کی ٹانگیں ایک طرح بیٹھے بیٹھے سُن ہو گئی تھیں۔ اس نے بستر کا سہارا لیا، اور کہیں ٹانگیں پھیلانے کی جگہ نہ پا کر پاؤں کھڑکی سے باہر لٹکا دیئے۔ رات اب گہری ہو چکی تھی۔ ہوا میں سردی آ چکی تھی! لیکن عذرا کی آنکھوں سے نیند اب بھی کوسوں دور تھی اور ماضی کی یادیں کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔

اور دوسری مرتبہ بھی سیاست ہی کی وجہ سے اس کی زندگی کا دھارا پلٹا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو برطانوی سامراج کی غلامی سے نجات ملی۔ سلمان اور عذرا نے اختلاف بیاں کے باوجود سچے دل سے آزادی کی خوشی

منائی ..... لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی آپس میں اختلافات شروع ہو گئے۔ کچھ لوگ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تھے اور دوسری پارٹیوں میں شرکت کر لی تھی۔ اور اسی کے ساتھ عذرا کے گھر میں بھی دو محاذ بن گئے تھے۔ سلمان کانگریسی تھا اور عذرا پکی انقلابی۔ کسی نہ کسی بات پر روز جھڑپ ہوتی۔ کبھی گھریلو معاملے پر بات شروع ہوتی۔ اور سیاست پر تان ٹوٹتی۔ کبھی سیاسی بحث چھڑتی۔ اور گھریلو جھگڑے پر جا کر ختم ہوتی۔

عذرا اس زندگی سے بہت بیزار ہو چکی تھی۔ لیکن آزاد کی محبت کا بندھن ایسا تھا کہ توڑے نہ ٹوٹتا تھا ..... اس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ سلمان اسے عذرا کے ساتھ نہ جانے دیگا!

ان کی آخری فیصلہ کن لڑائی بھی آزادی پر ہوئی۔ عذرا کا کہنا یہ تھا کہ آزاد میرا بیٹا ہے .... میں نے اسے نو مہینے پیٹ میں رکھا دو برس دودھ پلایا۔ اور اپنا خون جلا جلا کر اُسے پالا ہے مجھے حق ہے کہ جیسے چاہوں اُسے رکھوں اور اس کی تربیت کروں۔ سلمان کہتا اس کی شخصیت کو کچلنے کا نہ مجھے حق ہے نہ تمہیں۔ تم نے اگر اُسے جنم دیا تو یہ فطرت کا اصول ہے۔ آزاد پر کوئی احسان نہیں تم اس کی روح کی مالک نہیں بن سکتیں۔ جب میں تمہیں مجبور کر کے اپنا ہم خیال اور پابند نہیں بناتا تو تم کیسے اس معصوم کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ سکتی ہو؟ غرض یہ بحث بڑھتے بڑھتے لڑائی بن

گئی۔ تو تو میں میں پہ نوبت پہنچی سلمان آپے سے باہر ہو گیا! عذرا نے سلمان کو کبھی اس قدر غصّہ میں نہ دیکھا تھا۔ آج کی باتوں نے اس کا دل توڑ دیا اس نے شوہر اور بچّے دونوں کو تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بغیر کچھ کہے سُنے اکیلی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ غصّے کی آگ میں بچّے کی محبت بھی بھسم ہو گئی تھی

اور اب جو اس نے سیاسی کام شروع کیا تو مصلحت بینی اور احتیاط کو بالکل ہی ترک کر دیا۔ اب وہ ایسی انتہا پسند تھی جو مصلحت کو بزدلی اور سمجھوتہ کو مکاری سمجھتی تھی۔ وہ دھڑلّے سے حکومت کی مخالفت کرتی رہی۔

سلمان نے بار بار صلح کی کوشش کی۔ پشیمانی کا اظہار کیا مگر عذرا اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ ہوئی۔ اس کا جوش بڑھتا گیا۔ اس کے دل کی لگن اس کی زبان سے شعلے بن کر برستی، اور سُننے والوں کے دل میں آگ لگاتی رہی۔ اس کی تقریریں اور کام حکومت کی نظر میں خطرناک سمجھے جانے لگے اور آخر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ چھ مہینے تک جیل کی قید و بند کی زندگی بسر کرتی رہی۔ وہ سلمان اور آزاد کے خیال کو اب بھی دل میں نہ آنے دیتی۔ مگر کبھی کبھی رات کو جب وہ سخت اور سرد زمین پر پڑ کر سو جاتی تو ان دونوں کا خیال چور کی طرح دبے پاؤں اس کے دل میں جا گھستا اور صبح کو اس خیال کا دُھندلا سا نشان باقی رہ جاتا۔ وہ اپنے کو نفریں کرتی کہ کیوں اب تک اس نے جذبات پر فتح نہیں پائی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد بھی ترک محبت

کی یہ جدو جہد اس نے جاری رکھی — لیکن آج —— آج بچے کی بیماری کا یہ تار پاتے ہی ساری کوششیں کچے رنگ کی طرح بہہ گئیں۔ سخت دل انقلابی کارکن اب پھر وہی نرم دل عورت تھی۔ وہی ماں جس کے سینے میں ممتا کا چشمہ اُبل رہا تھا اور محبت کے پیدا ہوتے ہی انصاف کا جذبہ بھی جاگ اُٹھا۔ سلمان کی سخت گیری اور ناانصافی کے نقش مٹنے لگے اور اپنی شدت پسندی اور انتہاپسندی اپنی غلطیوں کی یاد ابھر آئی۔ میں نے کون سی رواداری برتی۔ کب ٹھنڈے دل سے مصالحت کی کوشش کی۔ میں چاہتی رہی کہ سلمان میرا ہم خیال بن جائے۔ میرے دماغ سے سوچے۔ میں یہ کیوں بھول گئی کہ اُسے بھی اپنی رائے رکھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا مجھے اور جب وہ میرا ہم نوا نہ بن سکا تو میں نے اُسے چھوڑ دیا —— بچے کو چھوڑ دیا۔ اور گھر بار کو ٹھوکر مار کر چلی آئی۔ اگر ذرا سہار سے کام لیتی تو کیا ہم دونوں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا طریقہ نہ سوچ لیتے؟ جو بات کل تک وہ بالکل ناممکن سمجھ رہی تھی آج نہ صرف ممکن بلکہ آسان نظر آ رہی تھی۔" آہ۔ میں یہ بھول گئی کہ مجھ پر الگ ملک اور قوم کے حقوق ہیں تو اپنے شوہر، بچے اور گھر کے بھی ہیں۔ میں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ سلمان گھرداری نہیں کر سکتا۔ بچے کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ اس میں اس کا سلیقہ ہی نہیں وہ اپنے کام کا دھنی ہے لیکن اور کسی چیز کی اس میں صلاحیت کہاں ہے۔ آخر یہی ہوا نا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال نہ کر سکا اور اُسے اپنی بہن کے پاس

بھیج دیا — ہائے میرے بچے" نے مجھے کیسے کیسے منت سماجت کے خط لکھے مگر مجھ کمبخت نے اسے جواب تک نہ دیا۔ اس لاڈلے بچے" کو جس پر جان دیتی تھی۔ بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا دل نہ ٹوٹ گیا ہوگا۔ بھلا جس بچے کے ماں باپ نے اس کی پروانہ کی اس کا دوسرے کیوں خیال کرتے؛ آج میرا لال سخت بیمار پڑا ہے۔ ہائے ہوتے ہوئے ماں باپ کے وہ ان کی محبت سے محروم رہا۔"

- - - - - - - - - - - - -

افق کی دودھیا روشنی دھیرے دھیرے پھیلتی جا رہی تھی۔ ہلکے نیلے آسمان پر صبح کا تارا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بمبئی کے گرد و نواح کے سرسبز میدان اور لاتعداد چھوٹی نیلے پانی کی جھیلوں پر سے کہرے کی چادر ہٹ رہی تھی — عذرا کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں بھی اوشا کی کرن جگمگا اٹھی ہے۔ ایک غیر معلوم روشنی سے اس کا دل منور ہو گیا — آنکھوں سے شفاف موتیوں کی لڑیاں ٹپک کر اس کے رخساروں پر کانپنے لگیں ایک ان دیکھی طاقت کے سامنے اس کا سر ہی نہیں دل بھی جھک گیا۔ اور دل کی گہرائیوں سے صدا اٹھی "اللہ میرا بچہ اچھا کر دے"۔

- - - - - - - - - - - - -

جے جے اسپتال کے جنرل وارڈ میں بہت سے بستروں کے بعد کمرے

کے آخری سرے پر ایک آٹھ سالہ نحیف و نزار بچّہ لیٹا ہُوا ہے اس کے جسم کی کھال ہڈّیوں سے چمٹ گئی ہے اور چہرے پر زردی چھائی ہے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کچھ چمک باقی ہے۔ لیکن ذہانت اور شوخی کی دمک نہیں رہی ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں جن میں موت کا سایہ کانپ رہا ہے۔ ایک چالیس سالہ دبلا پتلا مرد جس کا چہرہ اداس اور آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سوجی ہوئی ہیں۔ بچّے پر جھکا ہُوا بڑے پیار سے اس کے سیاہ گھنگریالے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا ہے۔ بچّہ بیقرار نظروں سے ...... چاروں طرف دیکھ کر ایک کراہ کے ساتھ دھیرے سے کہتا ہے" ابّا ——... امّاں کب آئیں گی؟ —— اب ہم۔ تھک گئے —— اور انتظار نہیں ہوتا ابّا —— اب ہم چلے جائیں گے"۔ باپ نے بڑی مشکل سے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا۔ اور بھرّائی آواز میں کہا" بس اب آتی ہی ہیں۔ میرے بیٹے کی امّاں"—— بچّے کے چہرے پر اُمید کا ہلکا سا رنگ دوڑ گیا اور باپ نے اپنی منتظر نظریں ہزار دیں بار دروازے کی طرف اٹھائیں....

عین اس وقت دھڑکتے دل اور لڑکھڑاتی ٹانگوں سے عذرا وارڈ میں داخل ہوئی۔ بیقراری سے چاروں طرف دیکھا اور پھر تڑپ کر بچّے کے پلنگ کی طرف دوڑی۔ بچّے نے بھی ماں کی طرف دیکھا —— جانے کہاں سے طاقت آگئی —— ادھر سے ماں باہیں پھیلائے دوڑی، اِدھر آزاد بستر پر اٹھ

کر بیٹھ گیا۔" میرا بچہ" — "میری امّاں" — دو چیخیں بلند ہوئیں اور دو برسے کے بچھڑے ماں بیٹے ہم آغوش تھے! عذرا کی بند آنکھیں آزاد کے سر پر ممتا کے موتی نچھاور کر رہی تھیں اور کان میں آوازیں گونج رہی تھیں "آنکھیں میچیں کون آئے — کون آئے — امّاں ابّا کی نائیں —" وہ سات برس پہلے کی دنیا میں محو تھی کہ جیسے کسی نے اسے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دھکیل دیا۔ آزاد کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں بند ہو چکی تھیں ہونٹوں کی دلآویز مسکراہٹ پتھر کی مورتی کے ہونٹوں کی مسکان کی طرح جم چکی تھی۔ ماں کی آغوش میں ایک بے جان جسم کے سوا اور کچھ نہ تھا روح پرواز کر چکی تھی۔

- - - - - - - - - - - -

سلمان نے جس کا چہرہ سفید، آنکھیں سرخ تھیں اور ماتھے کی رگیں ضبط کی کوشش میں ابھر آئی تھیں بڑھ کر گرتی ہوئی عذرا کو اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا — عذرا نے اپنا چہرہ سلمان کے سینے میں چھپا لیا دو تڑپتے دلوں کی دھڑکن سے ایک ہی آواز نکل رہی تھی۔

آزاد نے جان دے کر دو بچھڑے دلوں کو پھر سے ملا دیا۔

ماں

وہ مخمل سے زیادہ نرم گدے پر محو خواب ہے، اس کا حسین سر تکیے میں دھنسا ہوا ہے۔ اور رگ رگ میں میٹھی نیند کا لطف سمایا ہوا ہے۔ ایک فردوس گوش آواز اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہے "امی جان — میں آگیا"۔ مسہری کے سامنے ایک حسین نوجوان کھڑا ہے جس کے عضو عضو سے تندرستی پھوٹی پڑ رہی ہے اور کالی چمکدار آنکھوں سے ذہانت جھانک رہی ہے "امی جان" اُف اُس آواز میں کتنی مٹھاس، کتنا پیار، کتنی دل کشی بھری ہوئی ہے "بیٹا" اس کے نیم وا ہونٹوں سے نکلتا ہے اور وہ اپنی دونوں گداز بانہیں حسن و تندرستی کے اس مجسمہ کی طرف بڑھاتی ہے۔ جو اس کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہے اور اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی فردوسی جھولے میں ہلکورے لے رہی ہو......

"اماں اماں — پپا۔ پپا"

اُف یہ کیسی آواز ہے۔ یہ کیسے روح فرسا الفاظ ہیں یہ کون ہے جو اس کی جنت کو ڈھا دینا چاہتا ہے۔ وہ اور زور سے اپنے لال کو لپٹا لیتی ہے۔

"پپّا۔ پپّا۔ اماں۔ ہائے۔ ہائے"

ایک جھٹکے سے رضیہ کا سر پلنگ کے پائے سے لڑھک گیا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے کی کھڑکی سے کالے آسمان پر لاکھوں ننھے ننھے چمکتے ہوئے تارے ٹمٹماتے نظر آرہے تھے۔ اور پاس ہی کہیں دو کتے زور شور سے بھونک رہے تھے۔

یہ ایک سرکاری اسپتال کا خیراتی وارڈ تھا، جس میں برابر برابر لوہے کی چارپائیوں پر مریض پڑے ہوئے تھے۔ کوئی ہائے ہائے کر رہا تھا کسی کو نیند نے کچھ دیر کے لئے سب تکلیفوں سے بے خبر کر دیا تھا اور کوئی نیند میں بھی درد کے احساس سے غافل نہ ہو سکا تھا اور بار بار کراہ کی آواز اس کے مُنہ سے نکل جاتی تھی۔

رضیہ نے گھبرا کر اپنا سر اِدھر اُدھر گھمایا۔ اُف وہ کس سورگ سے اس نرک میں آپڑی۔ اس کا پیارا حسین بیٹا، اس کا آرام دہ کمرۂ خواب، یہ سب کیا ہُوا؟ ایک پل کے لئے اس کے دماغ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے پھر زمین پر اپنی ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں تا کہ وہ اس خواب کی دنیا سے پھر اپنی "حقیقت" کی دنیا میں پہنچ جائے۔

"ہائے ہائے —— امّاں —— پیا"۔

رضیہ نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ اب اس کا دماغ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھایا اور دھیرے سے مریض کے سر کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اس کے نیلے موٹے لٹکے ہوئے ہونٹوں کو لگا دیا ——

بچے نے ایک بار بخار سے سُرخ سُرخ آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا اور پھر چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے آہستہ سے بچے کو لٹا دیا اور خود اُسی طرح ٹانگیں زمین پر پھیلا کر اور سر مریض کے پلنگ کی پٹی پر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

اس کی نظریں مریض کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو دھیمی زرد روشنی میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک بارہ تیرہ برس کے نوعمر لڑکے کی شکل تھی۔ اس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا، گول اور خوبصورت تھا۔ جس کے نیچے ابھری ہوئی چوڑی پیشانی نظر آتی تھی؟ اور اس حسین سر و پیشانی کے نیچے ایک بدصورت بے رونق چہرہ اور بے ڈول جسم تھا جس میں جڑی ہوئی دو سوکھی لمبی بدنما ٹانگیں اس بھیانک تصویر کو مکمل کرتی تھیں۔ ہاں یہ تھا رضیہ کی اُمیدوں کا مرکز، اس کی زندگی کی کائنات، اس کے خوابوں کی تعبیر، اس کی مسرتوں کا منبع۔ اس کا اکلوتا بیٹا۔ وہ اپنا زرد ہاتھ اس کی بے رنگ پیشانی پر بے قراری سے پھیرنے لگی "میرا لال۔ میرا بچہ۔ اُف کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ بخار سے اس کا بدن کیسا جل رہا ہے، اے اللہ میرے بچے کو اچھا کر دے نہیں تو ...... یہ دُکھیا کس کے سہارے دنیا میں رہے گی؟"

کس کے سہارے ؟ مگر — مگر اسے اس بچے کا سہارا ہی کیا ؟ یہ اپاہج لڑکا جس کی ٹانگیں بے کار ہیں۔ دماغ ماؤف ہے۔ اور زبان و حواس کام نہیں کرتے یہ اس کا سہارا ہے ؟

رضیہ کی اُبلی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے جو کبھی بڑی حسین ہوں گی، اور اب اس کے زرد پتلے چہرے پر بہت بے جوڑ معلوم ہوتی تھیں آنسوؤں کے دو قطرے گر کر اس کے پھٹے دوپٹے میں جاذب ہو گئے۔ اس کے کانوں میں اپنے ہمدردوں کی آوازیں ایسے گونجنے لگیں جیسے ٹوٹا ہوا گراموفون کا ریکارڈ بج رہا ہو۔

"بچاری۔ رضیہ۔ یہ بچہ تو اس کی جان کا عذاب بن گیا ہے"۔

"دیکھو تو اتنے بڑے سوڈھینگ کو گود میں لادے لادے پھرتی ہے۔ زمین پہ چھوڑ دے تو آپ ہی جھک مار کر چلنے لگا"۔

"اے بوا ان کی ممتا دنیا سے نرالی ہے۔ کوئی اپنے حسین تندرست بچوں کو اتنا نہ چاہتا ہوگا۔ جتنا یہ اس پاگل اپاہج کو چاہتی ہے"۔

"اے ہے رضیہ کی اکیلی جان ہوتی تو اس کی دو روٹیاں کس کو بھاری تھیں۔ پہ یہ ان کا لوبر کا لوبر لڑکا اُسے کون بھگتے"؟

"بھلا کیا اس بچے کی زندگی۔ کون ماں کو اس سے کوئی سہارا ہے۔ مر جائے تو بچاری کا پنڈ تو چھوٹے"۔

"جب ماں نہ ہوگی تو اس نامراد کا کیا ہوگا؟ اس کے سامنے ہی مر جائے

تو سمجھو مٹی سوارت ہو گئی۔"

"اے بہن اتنے لاڈ تو نہ کیا کرو۔ تمہیں پیار آتا کیسے ہے اُس پر؟"

"بچاری کے خوبصورت تندرست بچے مر گئے۔ اور زندہ رہا تو یہ بدنصیب"

رضیہ نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ اُف ان ہمدردوں کی یہ روح فرسا آوازیں کہاں سے اُسے سُنائی دے رہی ہیں۔" انھیں سب نے کوس کوس کر میرے بچے کو بیمار ڈال دیا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اپاہج بچہ مر جائے گا تو میں آرام سے ہو جاؤں گی۔ ہائے بے سمجھ بے حس، بے درد لوگ۔ وہ کیا جانیں کہ یہی بچہ تو میری جان ہے، میری زندگی کا سہارا ہے۔ میرا ہے۔ میرا اپنا ہے اس کے سوا دنیا میں کون تھا کون ہوگا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ یہی تو ہے جس نے میری بیرنگ اجاڑ زندگی میں مٹھاس اور محبت کا رنگ پیدا کیا ہے میرا بچہ میرا چاند۔۔۔۔" اس نے بچہ کی پیشانی کو بے قراری سے کئی بوسے دیئے اور بخار سے تپتے ہوئے جسم کو زور سے سینے سے چمٹا لیا۔ درد، مصیبت اور بے غرض سچی محبت کا یہ ایک ایسا درد انگیز مرقع تھا۔ جس کو دیکھ کر پتھر کا دل بھی پانی ہو جائے۔

ایک پاگل اپاہج بچہ اور اس کی نادار محتاج ہڈیوں کا ڈھانچہ ماں مفلسی اور بے چارگی کی جیتی جاگتی تصویر۔ جو بارہ سال سے اس بچے کی خدمت میں اس طرح لگی ہوئی تھی کہ اُسے اپنے سونے کھانے کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

عزت ذلّت، ہوش نہوت، آرام تکلیف، محبّت، نفرت، اپنی ذات کے لئے برسوں پہلے وہ ہر جذبے سے خالی ہو چکی تھی۔ وہ جس کی زندگی چار سال کی عمر سے لے کر اب چالیس سال تک درد و مصیبت محرومی و ناکامی کی ایک ایسی مسلسل کہانی تھی جس کا کوئی اختتام نہ ہو۔ اور اب اس کے سارے جذبات و احساسات کا مرکز یہ بچّہ تھا۔ جو شخص اس کے بچّے سے محبّت کرتا یا ذرا سا میٹھا بول بول لیتا وہ اس کا احسان کبھی نہ بھولتی۔ اور جو اس پر حقارت اور نفرت کی نظر ڈالتا یا رضیہ کی ہمدردی میں اس کو بُرا بھلا کہتا۔ اس ہمدرد کی صورت سے اُسے نفرت ہو جاتی۔ یہ بے درد بے حس لوگ۔ آہ وہ اس کی یہ ذرا سی مسرت بھی نہیں دیکھ سکتے وہ کیا جانیں کہ رضیہ کو اس اپاہج، بدصورت بچّے سے کتنا پریم ہے اس کی سیوا میں اُسے کیسی شانتی، کیا رس، کتنا سکون نصیب ہوتا ہے۔

بچّے نے آنکھیں کھول دیں۔ بے حس، بے رنگ آنکھیں جن میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ کوئی خواہش نہ تھی۔ "امّاں" اور "پپا"۔ یہی دو بامعنی لفظ وہ اُسے بارہ سال کی کوشش میں سکھا پائی تھی۔ ماں اور پانی۔ زندگی کی دو اٹل ضرورتیں جن کا احساس اس بچّے تک کو تھا۔ جس کے لئے ڈاکٹروں نے تشخیص کر دیا تھا کہ اس کے دماغ میں حرام مغز نہیں بن سکا ہے۔

رضیہ نے بچّے کو لٹا دیا اور خود بھی پائے پر سر جھکا کر سونے کی کوشش

کرنے لگی۔ مگر نیند — آہ دنیا کی شیریں ترین شے — نیند۔ اس سے کوسوں دور تھی۔ اور بیتی زندگی کے کچھ گڈمڈ سے، الجھے ہوئے سے نقشے اس کے ذہن میں اُبھر اور مٹ رہے تھے۔ بیتی زندگی۔ بیتی زندگی .....

بچپن کا سنہرا زمانہ، جب ماں کی پُر محبت آغوش اس کا گہوارہ تھی اور باپ اپنی ساری پونجی اس اکلوتی بچی پر نچھاور کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اور سارا خاندان اس پہ صدقے واری رہا کرتا تھا! ..... آہ یہ مبارک زمانہ اُسے ذرا بھی یاد نہ تھا۔ اور اگر اس نے لوگوں سے بار بار اس کا ذکر نہ سُنا ہوتا تو وہ تصوّر بھی نہ کر سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہوگا جس میں محبت تھی، راحت تھی، عیش تھا آرام تھا، اس کی تو سب سے پہلے یاد ہی اتنی رُوح فرسا تھی جس کے خیال ہی سے وہ کانپ جاتی۔ مگر چار سال کی عمر میں اس کے ننھے سے دماغ پر جو اور بھیانک تصویر نقش ہو گئی تھی وُہ آج تک نہ مٹ سکی تھی۔ اُ کے ماں اور باپ دونوں لکڑی کی طرح اکڑے گندگی میں لت پت پڑے ہوئے ہیں —— اور وہ کبھی ایک کی چھاتی سے لپٹ کر روتی ہے، کبھی دوسرے کی مگر ان میں سے کوئی نہیں جاگتا، کوئی اسے نہیں چمکارتا۔ یہاں تک کہ وہ بھی بے خبر ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے آگے اُسے کچھ بھی یاد نہ تھا! ..... ہاں جب اس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے کو ایک .... بوڑھی عورت کی گود میں پایا جو اس کو لپٹا لپٹا کر رو رہی تھی —— یہ تھیں اس کی خالہ اماں جن کے سائے میں

اُس کو اپنی باقی عمر گزارنی پڑی۔

اُف کتنی تیز مزاج اور بدگمان تھیں یہ خالہ اماں، جن کا قول تھا کہ لڑکی کو کھلائے سونے کا نوالہ اور دیکھے شیر کی نگاہ۔ اُسے یاد نہ تھا کہ انھوں نے اُسے سونے کے نوالے کھلائے تھے یا نہیں۔ البتہ یہ اُس کے ذہن میں خوب نقش تھا کہ ان کی نگاہ شیر کی سی .... اور خوفناک آواز ویسی ہی گرج دار۔ وہ ہنسی کیوں؟ روئی کیوں؟ فلاں سے بات کیوں کی؟ صبح کو دیر سے کیوں اُٹھی؟ رات کو سویرے کس لئے نہیں سوتی؟ دروازے کے قریب کیوں گئی، نماز پڑھی یا نہیں، تلاوت کی یا نہیں — احکام و سوالات کا ایک سلسلہ تھا جو کبھی ختم نہ ہوتا تھا اور جس نے اُس کی روح کو مسل اور جسم کو کچل دیا تھا۔ نہ اس کا قد و قامت بڑھ سکا، نہ چہرے پر سُرخی اور شگفتگی آئی۔ نہ اونچی آواز میں بولنے یا کسی بات میں اختلاف کرنے کی جرأت اس میں پیدا ہو سکی۔ وہ تو ایک مشین تھی جو خالہ اماں کے اشاروں پر چلا کرتی — بظاہر بے زبان بے حس مشین — مگر اس کے دل کے اندر خیالات اور احساسات کا جوالا پھوٹتا رہتا، جذبات کا جو طوفان اٹھا کرتا تھا، اُسے کسی نے محسوس نہ کیا۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ بے ماں باپ کی اس لڑکی کے دل میں کیا ہے؟ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا سوچتی ہے؟ اُسے کوئی بھی ہمدم و ہمراز نہ ملا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی جلتی رہی اور ان سب کا اثر اس کی صحت پر پڑتا رہا۔ جوانی کی یہ بہار عمر

میں بھی وہ ایسی ہی زرد رو، افسردہ اور خاموش رہی۔ ہاں اگر کوئی غور سے دیکھتا تو اس کی بڑی بڑی افسردہ آنکھوں میں کبھی کبھی ایک بھوک ایک چمک نظر آتی۔ ایک ایسی چمک جس میں بغاوت کی آگ تھی! انقلاب کا طوفان تھا۔ اس سماج کو بدلنے، اس ماحول کو کچلنے کی آرزو —— یہی ایک واحد نشانی تھی اس کی جوانی کی —— جو ایک لمحہ کے لئے پیدا ہوتی اور پھر جانے دل کی کس گہرائی میں جا کر چھپ جاتی۔ اور جب لوگوں نے اس کے جوان ہونے کے چرچے کئے اور اس کے بیاہ کا ذکر فکر شروع کر دیا تو جیسے اُس کی سوئی ہوئی جوانی کے احساس کو جگا دیا تو یہ مخصوص چمک کچھ اور زیادہ بڑھ گئی —— ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی شے کی تلاش میں ہے۔ جسے پا کر وہ ان سب بندشوں کو توڑ ڈالے گی اور اپنے کو آزاد کرا لے گی —— جہاں یہ روک ٹوک نہ ہوگی، پڑھنے لکھنے، اُٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے پر پابندی نہ ہوگی۔ وہ دنیا کو دیکھے گی، سمجھے گی، جانے گی کہ وہ کیا ہے اور اس میں کیا کچھ ہونا ہے۔ لیکن پھر—— پھر خالہ اماں اور دوسرے شفیق بزرگوں نے بڑے چاؤ کے ساتھ اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔ اس کے ماموں کا بیٹا نذیر اس سے زیادہ زرد رو مریض دبّو اور خاموش —— اس کی جیون نیا کا کھوّیا بنایا گیا! —— نذیر جو اسے ذرا بھی پسند نہ تھا۔ اس کمزور دبلی پتلی مرجھائی ہوئی لڑکی کے دل میں ایک ایسے ساتھی کی تمنا تھی جو حسن و تندرستی، طاقت و قوت، بہادری اور بیخوفی

کا مجسمہ ہو۔ جس کے اندر کھو کر وہ اپنی کمیوں کو بھول جائے، جس کا سہارا پا کر وہ دُنیا میں وہ سب کچھ کر سکے جس کا اٹھارہ بیس برس تک وہ خواب دیکھتی رہی ہے۔ وُہ دنیا میں عزّت، طاقت، دولت اور شہرت پا سکے، علم حاصل کر سکے۔ سیر و سفر کر سکے۔ آہ — وُہ سب کچھ کر سکے جو نہیں کر پائی — مگر نذیر کے پلے بندھنے کے بعد وہ کیا کرے گی؛ وہ تو وہی پہلے جیسی بے بس کمزور رضیہ رہے گی! اس نے بار بار چاہا کہ خالہ امّاں سے کہہ دے کہ وہ نذیر سے شادی نہ کرے گی۔ ہرگز نہ کرے گی اور اس کی نظروں میں ایک ان دیکھا وجیہہ اور ہنس مکھ چہرہ گھومنے لگتا اور آنکھوں کی مخصوص چمک اتنی تیز ہو جاتی جیسے اس آگ میں سب کچھ بھسم کر دے گی۔ مگر۔ خالہ امّاں کی سُرخ سُرخ آنکھیں اور چچا جان کا پُر خشونت چہرہ دیکھتے ہی یہ آگ برف کی طرح سرد ہو جاتی اور وہاں سوا حسرت و یاس کے، اور کچھ باقی نہ رہتا۔

اور آخر وہ نذیر سے بیاہ دی گئی۔ مریض و مدقوق شوہر نے اس کی پوری پوری "قدر" کی۔ اس کے پاس دولت نہ تھی کہ وہ رضیہ کو عیش کرا سکتا۔ البتہ محبّت کی فراوانی تھی جس کی وہ اس پر مسلسل بارش کرتا رہا یہاں تک کہ رضیہ کی نس نس کا خون، دل کی گرمی آنکھوں کی چمک، سب اس کی وحشیانہ محبّت کی بھینٹ چڑھ گئی اور سال بھر کے اندر اندر وہ جانے کتنے نسوانی امراض میں مبتلا ہو کر چھ مہینے تک زنانہ اسپتال میں پڑی ایڑیاں رگڑتی رہی

اس کا بغاوت کا جذبہ خاک ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک بے بس نفرت ایک مجبور غم نے چھین لی تھی!

رضیہ ایک طرح بیٹھے بیٹھے شل ہو گئی تھی۔ اسپتال کی زمین اب اتنی سرد ہو چکی تھی کہ اس کے نیچے بچھا ہوا دری کا ٹکڑا اس کی خنکی کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا اور یہ سردی اس کی ٹانگوں سے ہوتی ہوئی اس کے سر تک پہنچ رہی تھی۔

اُف اتنی ہی سرد اور بے کیفنہ تھی اس کی یہ بیس سالہ زندگی بھی جس میں اُسے شوہر کی محبت کو گوارا کرنا پڑا۔ ساس نندوں کی تربیت کو سہنا پڑا۔ مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور بیماری سے مسلسل لڑنا پڑا۔ اپنی بھی اور نذیر کی بھی سال میں ایک دو مہینے وہ خود خیراتی اسپتال میں رہ آتی۔ اور دو تین مہینے نذیر وہاں کاٹ آتا۔ وہ دق کا مریض تھا۔ لیکن اس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ باقاعدہ علاج کرا سکے۔ اچھا کھانے پینے کو نہ تھا جس سے صحت بحال ہو جائے، وقت نہ تھا جس میں آرام کر سکے۔ وہ میٹرک تک پڑھا تھا! مگر اُسے آج تک کوئی باقاعدہ نوکری نہ ملی تھی وہ پرائیویٹ ٹیوشن کرتا، دکانوں پر حساب کتاب لکھا کرتا۔ اور اس طرح اپنا، بیوی، ماں اور بہن کا پیٹ کسی نہ کسی طرح پالتا رہا...... مگر جب وہ زیادہ بیمار ہو جاتا تو مجبوراً اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑتا۔ اور پھر یہ زمانہ کیسی سختی میں گزرتا۔ یہ رضیہ کا دل ہی جانتا تھا۔

یہ سب کچھ تھا مگر اس حال میں بھی سارے خاندان کو نذیر کے بچے کی تمنا

نے بے قرار کر رکھا تھا۔ بلا سے ماں کمزور اور بیمار ہے۔ مگر بچہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ بھلا وُہ عورت ہی کیا جو اپنا مقصدِ حیات پورا نہ کر سکے اور شوہر کی گود بچوں سے نہ بھر دے۔ باپ مدقوق ہے تو ہوا کرے۔ پر اس کا نام تو باقی رہنا ہی چاہیئے۔

اور آخر برسوں کی منّتوں، مرادوں کے بعد وہ امید سے ہوئی۔ اب رضیہ کا دل بھی اُمید و آرزو کے ہلکے ہلکے جھکورے لے رہا تھا۔ وہ آ رہا ہے۔ اس کا بچہ اس کی خوشی اور امید اس کی زندگی کا سہارا۔ کبھی کبھی مسرت کی ہلکی سی لہر اس کی یاس میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ایسی نظر آنے لگتی۔ جیسے تاریک سمندر میں روشنی کا مینارہ چمک اُٹھتا ہے۔

اس کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا۔ خوبصورت، موٹا تازہ۔ مگر مردہ۔ ماں اتنی کمزور تھی کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ زندہ بچہ پیدا نہ کر سکی۔ پھر دو سال بعد ایک بچّی پیدا ہوئی۔ اتنی دُبلی اور چھوٹی جس پر آدمی کے بچّہ ہونے کا گمان ہی مشکل سے ہوتا تھا۔۔۔ اس ننھی سی جان نے دو ہفتے جوں توں اس دنیا میں کاٹے اور پھر بیزار ہو کر جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی گئی۔۔۔ اور رضیہ پھر رنج و حسرت، یاس و ناکامی کے سمندر میں ڈوبنے لگی۔

نذیر کی صحت اور زیادہ گرتی جا رہی تھی اور اسی مناسبت سے افلاس و فلاکت اپنا سایہ گہرا کرتی جاتی تھی۔ نگر وہ کھانس کھانس کر اور خون تھوک تھوک

کر پیٹ بھرنے کے قابل روزی کماتا رہا اور اسی زمانے میں پھر رضیہ کو یہ اُمید ہوئی کہ وہ اپنے مریض شوہر کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دے گی وہ نو مہینے مسلسل بیمار رہی۔ اس کے جسم میں خون نہ تھا۔ ہڈیوں میں طاقت نہ تھی، مگر تخلیق کا بے پایاں جذبہ اُسے گھسیٹ رہا تھا۔

اور آخر ایک دن موت سے زبردست جنگ کرنے کے بعد رضیہ نے اس ـــــ عجیب الخلقت بچے کو جنم دیا۔ سارا خاندان خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا ـــ وہ آگیا ـــ باپ دادا کا نام چلانے والا، نسل قائم رکھنے والا فرشتہ۔ بلا سے اگر اس کی صورت بُری ہے۔ جسم بے ڈول ہے۔ ٹانگیں بے حد پتلی اور سر بے انتہا بڑا ہے کیا ہُوا؟ جیتا بچ جائے یہی نام روشن کرے گا۔ رضیہ نے جب اس پر نظر ڈالی تو بیک وقت اس کے ہونٹوں پر مسرت کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نم کے آنسو تیرنے لگے۔ "اوہ خالق! ـــ کیا تجھے میری تمنا اس طرح پوری کرنی تھی؟ تیرے ہاتھ میں تو یہ بھی تھا کہ اسے تندرست اور خوبصورت بنا دیتا"۔ رضیہ انجان، بے خبر عورت وہ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ بچہ جو اس جیسی کمزوریاں اور نذیر جیسے مریض باپ کی اولاد ہے۔ جن کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملا ہے۔ جنہیں دوا کے نام پر سرکاری اسپتالوں کا صرف کڑوا پانی پینے کو ملتا رہا ہے جن کو اپنی ساری طاقت اور قوت دو وقت کی روکھی روٹی فراہم کرنے میں صرف کر دینی پڑی ہے ان کے جسم تخلیق کے مقصد سے بہت دُور رہ کر طاقت

کھو چکے ہیں۔ جس کے بل پر تندرست اور ذہین بچے وجود میں آتے ہیں۔ وہ یہ کچھ بھی نہ جانتی تھی وہ تو صرف اتنا سمجھ پائی کہ اس کی زندگی پہلی اور آخری تمنا ایک اپاہج بچے کی صورت میں پوری ہوئی ہے۔ بجلی کی لہر کی طرح اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اور بچوں کی طرح یہ بھی ختم ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ مگر۔۔ مگر جانے کہاں سے سوئی ہوئی ممتا نے انگڑائی لی۔ وہ کانپ گئی۔ اور اس نے ننھے کو چھاتی سے لگا لیا۔

اور یہ بچہ پلتا رہا بڑھتا رہا۔ مگر نہ اس کے منہ سے بے معنی غوں غاں کے سوا کوئی لفظ ادا ہو سکا اور نہ وہ پیروں پر کھڑا ہو سکا...... اس سے خاندان کے لوگوں کی محبت اور توجہ جس تیزی سے کم ہو رہی تھی ماں کی محبت اسی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔۔ یہاں تک کہ مریض باپ بھی اب اپنے اس نام چلانے والے سے بیزار سا نظر آتا تھا۔ وہ سوچتا "یہ اپاہج گونگا بچہ بھلا کیا میرا اور میرے باپ دادا کا نام چلائے گا۔ کاش۔ کاش۔ اور سینکڑوں کاش اس کے دماغ میں کیڑوں کی طرح رینگنے لگتے"۔ کاش جو اس کے طبقے کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔

آخر رفتہ رفتہ نذیر بالکل ہی صاحب فراش ہو گیا اور رضیہ کو دین دنیا دونوں سیاہ نظر آنے لگے ــــ اب کیا ہوگا؟ بھوک کا خونناک بھوت اب اس کو اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا نظر آتا تھا۔ وہ کہاں جائے

گی۔ کس کے سہارے وہ اور اس کا بچہ زندگی گزاریں گے؟ اور پھر بارہ پندرہ برس تو آدمی جانور کے ساتھ رہے تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے اور یہ تو بہرحال اس کا شوہر تھا۔ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ اور نذیر چھ برس کے معذور بچے اور جوان بیوی کو بے سہارا چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔ اور رضیہ ایسی تڑپی ایسی بلکی کہ کیا کوئی عورت اپنے محبوب کے لئے بے قرار ہوگی۔ اس میں بھی ہندی عورت کی فطرت کارفرما تھی جو خاوندوں کے ساتھ جل مرنا خوش نصیبی سمجھا کرتی تھیں۔ مجبور۔ بے بس انجان ہندی عورت کا ایک روپ رضیہ بھی تھی۔ جو نہیں جانتی تھی کہ اگر حالات سازگار ہوتے اگر ماحول اور سماج نے اُسے اس طرح نہ کچل دیا ہوتا۔ تو وہ اس سے بہتر زندگی بھی گزار سکتی تھی! ایک پر مسرت اور خوش باش زندگی جس میں اس کے سفر زندگی کا ساتھی اس کا سچ مچ کا رفیق، اس کا محبوب اور عاشق ہوتا۔ اس کا سچا سہارا۔ اس کے گلشن حیات میں تازہ بتازہ پھول کھل سکتے تھے۔ جن کے ساتھ وہ بھی ہنستی وہ یہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اُس کو تو صرف یہ احساس تھا کہ قسمت نے جو اُسے دیا تھا وُہ بھی اس سے چھین لیا اب اس کے پاس سوا ایک مرجھائے پھُول کے اور کچھ بھی باقی نہیں رہا اور اس سوکھے ہوئے پھول کو اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس پر تُل گئی کہ مرنے والی کی اس نشانی کو خونِ جگر سے سینچے گی اور اسے ہرگز مرجھانے نہ دے گی۔

اب رضیہ کی سُن ٹانگوں نے پھیلنے سے انکار کر دیا۔ وہ گھٹنے پیٹ میں دبیئے دونوں بازو چھاتی پر لپیٹے سردی سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر نہ سردی اس کا پیچھا چھوڑتی تھی، اور نہ ماضی کی دُکھ بھری یادیں۔

اور دو سال بعد خالہ اماں بھی مر گئیں کچھ دن رضیہ نے نند اور دیور کے ساتھ گذارے۔ مگر یہاں اس کو وُہ عزّت اور آرام نہ ملا جس کی وہ بھوکی تھی! اور آخر کار اس نے اپنے شوہر کے ٹوٹے پھوٹے مکان میں تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ عزیزوں نے منع کیا مگر وہ مانی نہیں۔ اب اس کے سامنے بڑا اہم اور کٹھن سوال یہ تھا کہ وہ کیا کھائے۔ عزیز اوّل تو خود تنگ دست تھے۔ دوسرے مدد کے لیئے اس شرط پر آمادہ تھے۔ کہ وہ ان کے پاس رہے اور دو روٹیاں کھاتی رہے۔ اسے کوئی ایسا ادارہ یا محتاج خانہ نظر نہ آتا تھا جہاں اپاہج بچّے کی سیوا یا بیوہ عورت کی سہاتا کا کوئی انتظام ہوتا۔ کوئی صورت گذارے کی نظر نہ آئی تو اس نے محنت مزدوری کی ٹھانی اور ایک کارخانے میں بیڑی بنانے کا کام کرنے لگی۔ اور بری بھلی طرح ماں بیٹے کا پیٹ پلنے لگا! لیکن عزیزوں نے جب یہ سنا کہ وہ ان کے سے عالی خاندان کی فرد ہوتے ہوئے مزدوری کرتی ہے تو ان سب کی ناکیں خطرے میں پڑ گئیں وہ بہت برہم ہوئے لیکن اسے تو دو جانوں کا پیٹ پالنا تھا۔ وہ اب کنواری کم عمر لڑکی تو نہ تھی جو خالہ اماں کی دھمکیوں سے ڈر جاتی۔ وہ کام کرتی رہی

اور سب نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ روز اپنے آٹھ نو برس کے بچے کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتی ہوئی کام پر پہنچ جاتی۔ راستہ میں جب لوگ اسے اس ہیئت میں دیکھ کر ہنستے تو رضیہ کا کمزور جسم غصے سے کانپنے لگتا۔ اُف یہ بے درد انسان جو کوئی مدد نہیں کر سکتے، علاج دوا نہیں کرا سکتے تو کم سے کم اتنا تو کر سکتے ہیں، کہ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ وہ اس طرح غصہ سے کھولتی رنج میں ڈوبی کام پر پہنچ جاتی اور دن بھر بیٹھی بیڑیاں بنایا کرتی مگر اس کی مصیبت ختم نہ ہوئی تھی! بچہ جو دُنیا کی کوئی بات نہ سمجھتا تھا نہ کوئی کام کر سکتا تھا۔ اس نے بڑی آسانی سے بیڑی پینا سیکھ لیا اور اس جرم پر اُسے کام سے علیحدہ کر دیا گیا! لیکن پیٹ کو روٹی تو اب بھی چاہیے تھی۔

چار ہمدردوں کی مدد سے اب اُسے۔ لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ مگر یہ سب شرفا اس بات پر مُصر تھے کہ وہ اپنے بچے کو ساتھ نہ لایا کرے۔ شاید اس کو دیکھ کر ان کا ضمیر کچھ ملامت کرتا تھا۔ یا ان کے "ذوق سلیم" پر بار پڑتا تھا۔ اس لئے اُسے بچے کو گھر میں بند کرکے پڑھانے کے لئے جانا پڑتا اور جب وہ تھکی ہاری واپس آتی تو دیکھتی کہ بچے نے گھر کے مٹکے لوٹے اور سب سامان خراب کر رکھا ہے اور خود گندگی میں لت پت ہے تو ایک دل خراش آہ اس کے مُنہ سے نکل جاتی "اے اللہ آخر کب تک میں یہ سب سہوں گی؟" اور اسی طرح اُس کے یہ دُکھ بھرے

دن گذرتے گئے۔ اس کے مُنہ پہ جھرّیاں پڑ گئی تھیں، بال سفید ہو چکے تھے اور چالیس سال کی عمر میں وہ ساٹھ سال سے زیادہ کی بڑھیا معلوم ہوتی تھی! بچّہ اب دو چار لفظ بولنے اور چار دن ہاتھ پاؤں کے سہارے چلنے لگا تھا اسے یہ امید بندھ گئی کہ شاید دو چار برس میں وہ سیدھا بھی چلنے اور کچھ اور زیادہ باتیں کرنے لگے۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بچّے ہی کو کھلاتی تھی۔ وہ شہر بھر کے ڈاکٹر، حکیموں کی جا جا کر خوشامد کرتی اور چند مہینے پہلے ہسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر صاحب کو اس نے ہاتھ جوڑ کر اس پہ راضی کیا کہ وہ اس کے بچّے کا معائنہ کر کے بتائیں کہ وہ کیسے اچھا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے غور سے بچّے کا معائنہ کیا۔ دماغ کا ایکسرے لیا اور رضیہ کو ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیا کہ اس بچّے کے دماغ میں پیدائشی نقص ہے جو کسی طرح دُور نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کی ٹانگوں کا علاج جزوی ہو جائے گا کہ ہو سکتا ہے جس میں کم سے کم پانسو روپے کا خرچ ہے — پانسو روپے! پانسو روپے!! رضیہ کے لئے پانسو روپے قارون کے خزانے سے بڑھ کر تھے وہ اپنی جان تو اپنے بچّے کے لئے آسانی سے دے سکتی تھی! لیکن روپیہ اور وہ بھی پانسو.... یہ وہ آسمان سے تارے توڑ کر لانے سے بھی زیادہ ناممکن تھا! اور آج امید کا یہ آخری تار بھی ٹوٹ گیا! اس نے بچّے کے مستقبل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ وہ بارہ سال تک سوچ سوچ کر بالکل تھک۔

چکی تھی! اور مایوسی کے اس آخری درجے پر پہونچ گئی تھی جہاں انسان اپنے کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتا ہے ؎

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

رضیہ کا جسم بالکل اکڑ چکا تھا۔ اس نے بڑی کوشش سے گردن موڑ کر پلنگ پر لیٹے ہوئے بچے کو دیکھا جو پچھلے آٹھ دن سے نمونیہ میں مبتلا موت اور زیست کی مسلسل کش مکش سے دو چار تھا۔ بچے کو جسمانی تکلیف کا تھوڑا سا احساس تھا۔ مگر ماں پہ جسمانی، روحانی اور ذہنی کرب کا یہ ایک ایسا دور گزر گیا۔ جس کا تجربہ خود اس کی دُکھ بھری زندگی میں بھی پہلے نہ ہوا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ آٹھ دن نہیں، آٹھ سال یا آٹھ صدیاں یونہی بیٹھے بیٹھے سوچتے سوچتے بیت گئی ہوں۔ اس حالت میں اُسے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ اُسے اپنے بدصورت اپاہج، دیوانہ بچے سے کس قدر محبت ہے۔ وہ اس کی جان ہے، جگر ہے۔ اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔ وہ نہ ہوگا۔ تو اس کے لئے یہ دنیا ایک ویران صحرا بن جائے گی.....

اور آج کی رات فیصلہ کن رات تھی کہ یا بچہ بچ گیا اور یا..... اس "یا" کو رضیہ لاکھ ٹالنا چاہتی، بھلانا چاہتی مگر بار بار یہ "یا" اس کے دماغ میں برمے کی طرح سوراخ کرنے لگتا تھا!

اور پھر جانے کب اُسے نیند آگئی یا وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب اُس کی

آنکھ کھلی تو اسپتال کی کھڑکیوں سے دھوپ کی کرنیں خیراتی وارڈ کو روشن کر رہی تھیں اور جہاں تہاں مریض کھانس اور تھوک رہے تھے۔ اور بڑے ڈاکٹر صاحب جھکے ہوئے اُس کے بچے کی نبض دیکھ رہے تھے۔

رضیہ کا پورا جسم یخ کی طرح سرد ہو چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں نیلی پڑ گئیں تھیں لیکن بچے پر نظر پڑتے ہی ایک برقی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی اور وہ ایک دم پلنگ کی طرف جھپٹی "ڈاکٹر صاحب۔ ڈاک۔ ٹر ساب۔ میرا بچہ۔ میرا لال۔ میرا۔ میرا" بچے کا پرسکون چہرہ اور میٹھی نیند دیکھ کر اس کا دل اُس بری طرح سینے میں پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے اب منہ کے رستہ نکل پڑے گا۔

بوڑھا ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہو گیا! آلہ اپنے گلے میں ڈالا اور رضیہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر ذرا سا مسکرایا "بہن گھبراؤ نہیں۔ تمہارا بچہ بچ گیا"۔

رضیہ کا ہاتھ اور نظریں ایک بار بے اختیار آسمان کی طرف اٹھیں! اور پھر وہ پلنگ پر بچہ کے اُوپر گر پڑی۔ اور اُسے اپنے کلیجہ سے لپٹا لیا دھیرے دھیرے اس کے منہ سے کچھ نکل رہا تھا! "میرا لال۔ میرا بچہ" ذرا دیر بعد یہ آواز آنی بھی بند ہو گئی۔ اور جب ڈاکٹر نے مامتا کی ماری دکھیا ماں کو بچے سے الگ کرنا چاہا۔ تو دیکھا کہ وہ دنیا کے سب جھنجھٹوں سے آزاد ہو چکی ہے۔

بُلا

وہ اپنے مخصوص کچھ پہاڑی کچھ میدانی لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس بڑے پہاڑی مرکز پر رہتے رہتے اُسے اُردو ہندی کے بہت سے موٹے موٹے لفظ بھی آ گئے تھے۔ جس زبان میں وہ گفتگو کرتا تھا اُسے میں سمجھ تو خوب رہی تھی مگر بالکل انھیں لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے۔ یوں سمجھئے کہ باتیں اس کی ہیں اور زبان کچھ اس کی اور کچھ میری۔ وہ پلتی مارے میرے سامنے برآمدے کے لکڑی کے فرش پر بیٹھا تھا اس کے بوسیدہ میلے کپڑوں سے ہوا کے جھونکے کے ساتھ ساتھ بو کا بھبکا آ جاتا تھا اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے اس کی چھوٹی چھوٹی میل اور چیکٹ سے بھری ہوئی آنکھوں میں جذبات کی شدت سے پانی آ جاتا تو وہ اپنے میلے انگوچھے سے انھیں پونچھ لیتا تھا۔

بی بی جی تم آج کی میری صورت ۔ یہ سوکھا ماڑا بدن دیکھ کر کیا سمجھو گی کہ میں کبھی بڑا تگڑا اور بڑا سندر گبرو تھا۔ ان بانہوں میں لوہے کی سی طاقت تھی۔ ان

ٹانگوں میں چیڑ کے تنے جیسا بل تھا! بی بی جی۔ مُنہ پہ سُرخی تھی! بالوں میں کالک تھی اور صورت پر چکنا چپڑا پن اور دل کی تو میں کہتا نہیں مگر میری استری۔ دم مجھے بہت سندر بڑا سجیلا جوان سمجھتی تھی! اُسے مجھ سے بڑا پیار تھا! اور میری بڑی سیوا کرتی تھی! مجھے بھی اس سے بڑا پریم تھا! اُسے میں نے پایا بھی تو کتنی کٹھنائی کے بعد تھا! پانچ ہزار ٹکے، پانچ ہزار خرچ کرنے پڑے تھے میرے باپ کو میرے بیاہ پر۔ تم ہماری طرف کی ریت رسم نہیں جانتی ہو بی بی جی۔ جب تک ہزاروں روپے لڑکی کے باپ کو نہ دیا جائے کسی کا بیاہ نہیں ہو سکتا چاہے وہ میرا جیسا غریب کسان ہی کیوں نہ ہو۔ جس کے پاس ذرا سی پہاڑی زمین اور ایک دو گائیں ہوں۔ پیسہ نہ ہونے کے کارن بہت جوان ہونے پر میرا بیاہ ہُوا۔ ہمارے گاؤں کے برہمن مہاراج جو ہمارے پنڈت بھی ہیں اور ساہوکار بھی' جن کی سرکار دربار میں پوچھ ہے جو سرکاری افسروں کو ڈالیاں اور نذرانے دیتے رہتے ہیں۔ باپ نے ان کی خوشامد کی تو انھوں نے اُسے روپیہ قرض دیا مگر اتنا کڑا سود لگایا اتنا کڑا کہ آج بارہ برس بعد خالی سود بھی ادا نہیں کر سکا ہوں۔ پانچسو تو انہوں نے پہلے ہی کاٹ لئے اور ساڑھے چار ہزار دیئے۔ پھر چار پانچسو دان دکشنا کے نام سے ہتھیائے۔ تین ہزار روپے لڑکی کے باپ کو دینے پڑے۔ ہزار روپے میں زیور کپڑا اور کھانا پینا کیا۔ تم نے تو بی بی جی ہماری طرف کی عورت کو دیکھا ہوگا نا۔ وہ تم لوگوں کی طرح چھوٹا چھوٹا

زیور نہیں پہنتی ۔ ایک ایک استری کے سر منہ اور بدن پہ پانچ پانچ سیر چاندی نہ ہو تو اُسے چین نہیں آتا۔ اور تم جانو بس بیاہ پہ ہی تو زیور ملتا ہے ۔ پھر سود اور قرضے کے چکر میں اس کا موقع ہی نہیں آتا۔ کہ اس کے لئے کوئی اور زیور گھڑوایا جا سکے ۔ اس سمے میں پانچ ہزار کا قرض کرتے زمین گروی رکھنے اور سود کا پہاڑ سر پہ لادنے کے باوجود میں اپنے کو بڑا قسمت والا سمجھتا تھا اتنا خوش تھا کہ مانو ساری دنیا کی دولت مجھے مل گئی ۔ ایسی سندر ایسی دیالو، پریم کرنے والی استری جسے مل جائے اُسے اور کیا چاہیئے ؟ میں اپنے کھیت سے آتا تو وہ مجھے گرم گرم روٹی مزے دار بھاجی اور گاڑھا گاڑھا سوندھا سوندھا دودھ دہی کھانے کو دیتی ۔ میرے بدن کی مالش کرتی، میرے پیر دباتی ۔ زندگی میں اس سمے رس ہی رس مٹھاس ہی مٹھاس تھی ۔ میرا بچہ جب میرے کندھے پر اچکتا یا جب میری سندرتا کی دیوی میری گود میں اپنا سر ڈال دیتی تو مجھے ایسا لگتا کہ سارے جگ کی دولت مجھے مل گئی ۔ میں یوں بھی بڑا خوش نصیب تھا کہ میرے اور کوئی بھائی نہ تھا ! میری بیوی مجھ اکیلے کی تھی ۔ تم شاید اسے نہ سمجھو گی بی بی جی ۔ ہماری طرف ایسے بیاہ بھی ہوں ۔ ایک استری کئی بھائیوں کی استری ہو ہے ۔ پر میں تو اکیلا اپنی استری کے پریم کا مالک تھا!

میں عجیب بیوقوف بنی اس کی باتیں سُن رہی تھی مگر اس کے ہاں کچھ اس قدر سادگی سچائی اور خلوص تھا کہ عشق و محبت کے اس بیان کو سُننے

سے جھجک یا شرمندگی کا احساس پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے تصوّر میں کھو گیا اور میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کے لئے سوال کیا تو کیا اب تمہاری بیوی ـــ" میں کہتے کہتے رُک گئی۔

"نہیں بی بی جی وہ مری نہیں زندہ ہے۔ اور اپنے گاؤں میں میری یاد میں برہا کے گیت گایا کرے ہے ..... پر میرے لئے تو مری برابر سمجھو برسوں گذر گئے میں نے اسے نہیں دیکھا لوگ کہیں ہیں رام چندر جی کو بن باس ملا تھا۔ پر اس میں سیتا جی تو ان کے ساتھ تھیں پھر وہ بن باس کیا ہوا؟ وہ تو اُن کے لئے سورگ ہوا۔ پر میرے۔ مجھ گڑھوالی مُلا کے لئے تو یہ بن باس سچّا بن باس ہے۔ مانا کہ مسوری میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں بولتی گاتی تصویریں ہیں، ناچ رنگ سے ہوٹل ہیں محل ہیں سجی سجائی دکانیں ہیں۔ مٹھائیاں میوے پھل اور طرح طرح کے کھانوں کی دکانیں ہیں مگر یہ سب تو دھنوانوں کے لئے ہیں، جو اپنی گڑیوں کی طرح سجی بنی چھل بل کرتی استریوں کو بغل میں لئے مال سڑک پر پھرتے رہے ہیں تماشے دیکھے ہیں۔ خوب کھاتے و کماتے ہیں ناچیں کودیں ہیں۔ اور ..... اور ....." میرے لحاظ سے اگلا جملہ اس نے نگل لیا اور پھر کھنکھار کر آگے چلا پر ہم جیسے غریب مزدوروں کے لئے تو یہ شہر بھی بن ہی ہے۔ ہمارا بن باس سچّا بن باس ہے۔ جسے نہ رام چندر جی جان سکتے تھے اور نہ ان

کے پجاری دودوان اور دھنوان لوگ۔ سوچو کتنے برس ہو گئے ہیں نے اپنے بچوں کو پیار نہیں کیا۔ اپنی پتنی کو دیکھا تک نہیں۔ اپنے کھیتوں کے درشن سے آنکھیں ٹھنڈی نہیں کیں۔ اپنی گایوں کو چارا نہیں کھلایا۔ بھگوان جانے یہ شبھ گھڑی کب آئے گی! اور آئے گی بھی یا نہیں۔"

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں کیوں اس کے ناسوروں کو چھیڑ رہی ہوں؟ پھر بھی افسانہ نگار کا تجسس غالب آیا۔ "پھر تم اپنے گاؤں جاتے کیوں نہیں؟ تمہارے بہت سے ساتھی جاڑے میں اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔"

"جا سکتا تو ضرور جاتا۔ بی بی جی۔ ضرور جاتا۔ مگر برہمن مہاراج کا قرضہ جو سر پر ہے۔ اور پھر ان سے جھگڑا کر کے بھاگا ہوں۔ تم لوگ ہماری طرف کی حالت نہیں جانتے۔ وہاں بہت بُرا حال ہے۔ بہت بُرا۔ آج سے بارہ برس پہلے میں سمجھتا تھا کہ یوں ہی ہوتا ہے۔ بھگوان نے چھوٹے بڑے، امیر غریب ذات پات کا بھید بھاؤ بنایا ہے۔ اور ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے پر اب۔ اب برسوں یہاں رہتے رہتے۔ دنیا کو دیکھ کر بہت کچھ سُن کر مجھے بھی۔ مجھ گنوار ان پڑھ بڈّھے کو بھی۔ یہ پتہ چل گیا ہے کہ ایسا نہیں۔ ہم بہت گرے ہیں۔ بہت غریب ہیں۔ ان پڑھ ہیں۔ ان جان ہیں۔ اس لئے کہ کچھ تھوڑے سے لوگ جن کے پاس پیسہ ہے، بُدھی ہے، اور بل ہے

ہمیں لوٹ رہے ہیں۔ ہمیں نوچ نوچ کھا رہے ہیں، ہمارا حق چھین رہے ہیں ہمیں قرض دیا جاتا ہے۔ تو ہم ساری عمر کما کما کر مر جاتے ہیں، سینکڑوں روپیہ دیتے ہیں مگر خالی سود تک ادا نہیں ہوتا اور قرض سر پر جوں کا توں لدا رہتا ہے۔ ہماری بیویاں مر مر کر گائے بھینس پالتی ہیں۔ اور افسر، حاکم اور پنڈت ان کو چھین لے جاتے ہیں۔ اگر انکار کرو تو کوڑے کھاؤ۔ جیل کی کوٹھری میں سڑو۔ یا پھر میری طرح گھر سے بھاگ کر جان بچا لو۔"

میں نے بات کاٹی، پہلے تمہارے ہاں راجہ راج کرتا تھا! اس کے زمانے میں ظلم ہوتے تھے مگر اب تو ریاستیں ختم ہو گئیں، اب تو وہ بھی آزاد ہندوستان کا ایک حصّہ ہے۔ اب تو وہاں یہ ظلم اور زیادتیاں نہیں ہونی چاہئیں۔"

"ہوگا بی بی جی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ آزادی اور غلامی میں کیا بھید بھاؤ ہے، وہاں کی تو بات چھوڑو، یہاں اس بڑے شہر میں بھی وہی زبردستی ہے، اپنا سے ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے دس آنے کی جگہ چھ آنے چار آنے پکڑا دیتا ہے اور اوپر سے دس بُری بھلی باتیں سُناتا ہے۔ دو دو اور چار چار گنا بوجھ ہم پر لاد دیا جاتا ہے اور مزدوری دینے سے ہمارا حق کاٹا جاتا ہے۔ پھر جو کماتے ہیں اس میں بنئے کا حصّہ ہے، سپاہی کا حصّہ ہے جمعدار، ٹھیکیدار کا حصّہ ہے۔ اور ہمارا حصّہ کیا ہے؟ بجھڑ کی موٹی روٹی اور سڑی بسی سبزی اور ایک کال کوٹھری جس میں دس دس قلی سوتے ہیں۔"

"مگر تم لوگ اپنے حق کے لئے آواز اٹھا سکتے ہو۔ ظالم اور رشوت خوار افسروں کے خلاف شکایت کر سکتے ہو، ستیہ گرہ کر سکتے ہو۔ اور تمہیں کرنا چاہیے جب تک تم لوگ خود اپنے حق کے لئے نہ لڑو گے۔ تمہارے حق تمہیں نہیں مل سکتے؟"

"مگر بی جی لڑے کون؟ اور ان کی سُنے کون؟" سب بدحال جاہل پچھلے دبلے لدّو بھینسوں اور جانوروں کی طرح بس محنت کرتے ہیں۔ اور کچھ نہیں جانتے کہ کیا ہو رہا ہے دنیا میں اور ان کا اپنا کیا حال ہے ـــ میں جو تم سے یہ دو دانوں کی سی باتیں بنا رہا ہوں ـــ یہ بھی باتیں ہی باتیں ہیں۔ اگر مقابلے کا وقت آ جائے تو پیچھے چھپ جاؤں گا۔ پھر میرے جیسے بھی ہم لوگوں میں کہاں ہیں۔ ہمارے لوگوں کو کسی پہ بھروسہ نہیں ہوتا۔ کوئی ان کی بھلائی کا کام بھی کرنا چاہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمیں کسی نئے جال میں پھنسا رہا ہے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گئی۔ دراصل سینکڑوں ہزاروں برسوں کے کچلے ہوئے ظلم وستم کا شکار جاہل، ان جان اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے پہاڑی نئی چیزوں کو آسانی سے سمجھ نہیں سکتے۔ قبول نہیں کر سکتے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ یہ نئی باتیں ان کی بھلائی کے لئے ہوں گی؟ وہ سمجھتے ہوں گے کہ نیا شکاری نئے نئے پھندے بنا کر لایا ہے اور اس میں ان کو پھانسنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا "مگر تم جیسے سمجھ دار لوگوں کو تو اپنے ساتھیوں کو سمجھانا اور جگانا چاہیے

ان میں آزادی کا، اپنے حقوق کا احساس پیدا کرتا کہ ان کی حالت سنورے اور وہ دنیا میں بہترین زندگی بسر کر سکیں"۔

اس کی آنکھوں میں حسرت چھا گئی" ارے بی بی جی جانے تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے — میں تو ایک غریب مصیبت کا مارا بلا ہوں۔ جسے دو وقت روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ جسے اپنے گاؤں جانا نصیب نہیں ہوتا۔ بی بی جی آج سے برسوں پہلے میں اسی آشا کے ساتھ سوری آیا تھا کہ یہاں بہت سی کمائی کروں گا اور پھر گاؤں واپس جا کر مزے سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہوں گا۔ کبھی کبھی تو۔ سیزن میں میں صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک مزدوری کرتا رہتا ہوں کتنے چکر کنک ریک سے کتاب گھر کے سوائے کے ہیکمن کے، کلرڑی کے، اور میں دور شال دیل" اور ہے پی ویلی" کے لگاتا ہوں اور جو ملتا ہے اُسے جوڑ جوڑ کر رکھتا ہوں تا کہ دیس کے برہمن مہاراج کا قرضہ چک جائے۔ اسی لئے پیٹ بھر کھانا تک نہیں کھاتا ہوں کہ پیسہ جوڑ کر گھر بھیجوں۔ پھر ایسے دن بھی آتے ہیں جب کئی کئی دن مزدوری نہیں ملتی اور مجھے بھوکا ہی سونا پڑتا ہے۔ پیٹ بھر کھانا بی بی جی میں نے برسوں سے نہیں کھایا۔ دن بھر کی یہ کڑی محنت اور بھوک کو بھڑکانے والی یہ ہوا پیٹ میں آگ جلتی رہی ہے۔ مگر میں تو جنم جنم سے بھوکا ہوں — بھوکا رہوں گا۔ پیٹ کی بھوک، من کی بھوک، دیس کی بھوک، آرام کی بھوک، اس

کی آواز ۔۔۔ دردناک حد تک بھیانک ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پہ جیسے موٹا موٹا لفظ بھوک جلی حرف میں لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بے سوچے سمجھے رات کی بچا روٹی سالن اندر جا کر تھالی میں لگا کر اس کے سامنے لا رکھا اس نے حیرت سے مجھے دیکھا شاید کبھی کسی نے اُسے آدر سے کھانا کھلانے کی زحمت ہی نہ کی تھی! مانگنے پہ اُسے روٹی یا آٹا یا پیسہ ملا بھی تو نفرت حقارت اور رحم کے جذبے کے ساتھ۔ ہمارا اونچا طبقہ جو ایسے لوگوں سے دُور دُور ہی رہنا پسند کرتا ہے ۔۔۔ جو رکشا میں بیٹھنے سے اس لئے گھبراتا ہے کہ قلیوں کے کپڑوں کی بدبو سے اس کا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ ان کے قریب کھڑے ہو کر اس لئے بات نہیں کرتا کہ ان کے منہ سے آنے والے بھبکے اس کی نفاست پسند طبیعت پر بار گزرتے ہیں۔ وہ بھلا سمجھ ہی کیا سکتے ہیں کہ ان غریبوں پر کیا بیت رہی ہے۔

پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو بے اختیار میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے میری جانب سے پیٹھ موڑ لی۔ اور اس ذوق و شوق سے یہ باسی روٹی کھانے لگا گویا من و سلویٰ کا خوان اس کے سامنے چنا ہوا ہے۔

جس دن میں مسوری پہنچی اُسی دن میری اس کی ملاقات ہوئی تھی ابھی پہاڑ پہ لوگ بہت کم آ رہے تھے۔ اور جیسے ہی کوئی موٹر یا بس رکتی تھی اس کی

طرف ایسے دوڑتے جیسے بھوکے گدھ مردار کی طرف۔ میرا سامان بہت سے قلیوں میں تتر بتر ہوگیا۔ وہ سب سے کمزور تھا مگر سب سے زیادہ چیخ رہا تھا۔ دوسرے قلی جو نسبتاً اس سے مضبوط تھے سامان پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگئے تھے اور خالی ہاتھ کھڑا اپنی پہاڑی بولی میں مسلسل بک رہا تھا اور دوسرے قلی اس پر ہنس رہے تھے۔ مجھ سے اس کا یہ حال نہ دیکھا گیا اور اپنا اٹیچی کیس جسے میں اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔ اُسے تھما دیا اور یونہی پوچھا "تمہارا نام کیا ہے" نام؟ اس نے بڑی حیرانی سے کہا۔ گویا جیسے بے حقیقت آدمی کا کوئی نام ہو سکتا ہے۔ بھلا؟

"ہاں ہاں آخر تمہارا کچھ نام تو ہوگا نا؟"

"اجی ہم لوگ بُلا کہلاتے ہیں ـــ یا پھر لوگ ہمیں فالتو کہتے ہیں۔"

"تمہارے باپ نے بھی تو تمہارا کچھ نام رکھا ہوگا۔" "ہوں" اس نے بڑی حیرانی سے کہا "میرا نام گودبندو ہے بی بی جی۔ تم جیسے بڑے لوگوں کو ہمرے نام سے کیا مطلب۔ تم سب تو ہمیں بُلا ہی کہتے ہو۔"

مجھے احساس ہُوا کہ یہ عام قلیوں جیسا بالکل بے حس اور لدو جانور ہی نہیں بلکہ اس میں احساس خودی اور اپنے حقوق کا کچھ پاس بھی ہے۔ راستے بھر یہ لدو بھینسے کی طرح ہانپتے ہوئے قلی میرے ضمیر پر مسلط رہے۔ اپنی کالج پر پہنچ کر میں نے ان کو معمولی سے کچھ زیادہ پیسے دیئے تو ان قلیوں

نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور حسب عادت بخشش بھی نہیں مانگی۔ اور مجھے یاد آیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کمینوں کو تو جھگڑا کرنے کی عادت ہوتی ہے یہ سیر و سفر کرنے والے سیاح، عیش پسند رئیس، آرام طلب صاحبان علم و فن، جو پہاڑوں پر آکر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ پر جب محنت کش کی مزدوری کا سوال آتا ہے تو دو دو چار آنے پر جھگڑتے ہیں بگڑتے ہیں۔ ان فاقہ زدہ پھٹے حال قلیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے اور دوسرے قلی کو بلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ یہ حضرات چند پیسے بچا کر ایسے خوش ہوتے ہیں۔ اس قدر فخریہ مسکراتے ہیں گویا جونک کی طرح غریب کا خون چوس کر بہادری کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

باقی قلی پیسے لے کر چلے گئے۔ یہ جاتے جاتے رکا۔ میری طرف دیکھا! اور بولا "بی بی جی کوئی کام ہو تو ہمیں بلانا —— ہم رکشا بھی چلاتے ہیں...... ہم حاضر ہے تمہارا کام کرنے کو۔ جب بلائے گا آئے گا۔ اور جب کبھی میری کاٹیج کے سامنے سے گزرتا تو ضرور سلام کر کے پوچھ لیتا تھا! کہ کوئی کام تو نہیں۔ اور اسی طرح میری اور اس کی دوستی شروع ہوئی تھی!

آج وہ میری کاٹیج کے بیچ کے حصے میں کچھ لوگوں کا سامان لے کر آیا تھا۔ یہ کچھ فن کار تھے جو مسوری کے مشہور ہوٹلوں میں اپنے رقص و موسیقی کے کمالات دکھانے کے لئے آئے تھے! ان میں بنگالی، پنجابی اور یوپی والے مرد

اور عورتیں کوئی پندرہ آدمی تھے۔ سب کے سب جوان تندرست خوش حال اور مگن۔ لیکن جب ان اپ ٹوڈیٹ فن کاروں نے جن میں سے بعض عورتیں پچاس ساٹھ کی ساڑھی اور مرد سو کا سوٹ پہنے تھے۔ ان قلیوں سے دو دو آنے کے لئے لڑنا شروع کیا اور لڑتے ہی چلے گئے "ہم تمہیں آٹھ آنے سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دیں گے..... کیوں اتنا سامان اٹھایا۔ ہم نے کب کہا تھا ریٹ سے ایک دمڑی زیادہ نہیں ملے گی" تو میں حیرانی سے ان کو دیکھتی رہ گئی۔ یہ ہیں ہمارے نئے دور کے فن کار؟ آرٹ کے دلدادہ، فن کے خادم! فن کار تو بڑا احساس بڑا دردمند بڑا ہمدرد ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوا تو اس کا فن بلندی کی چوٹی کو نہیں چھو سکتا۔ پھر یہ کیسے فن کار ہیں۔ جو غریب قلیوں کے دو دو آنے مار کر خوش ہو رہے ہیں

جب قلی بڑبڑاتے بگڑتے واپس جا رہے تھے تو گودیندو میرے دروازے کے سامنے رکا اور سلام جھاڑ کر بولا "دیکھا بی بی جی؟" میں غصہ سے یوں ہی ابل رہی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھے ان قلیوں پر بھی غصہ آ رہا تھا! "کیوں تم لوگ پہلے سے طے کر کے سامان نہیں اٹھایا کرتے۔ تاکہ ایسے لوگ تمہارا حق نہ مار سکیں۔ جب تک تمہیں پوری مزدوری نہ ملے ہرگز سامان نہ اٹھاؤ۔ جھک مار کر دیں گے۔ نہیں تو اٹھائیں خود بوجھ تو انھیں پتہ چلے"۔ اور یہ سن کر وہ میرے سامنے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا اور اپنے بھائیوں کا حال سنانا شروع کر دیا کہ مزدور کتنے بہت سے ہیں اور ہر سال بڑھ رہے ہیں۔ مزدوریاں کم ہیں اس لئے

کتنے ہی کم پیسے ملیں تب بھی ہم چھوڑ نہیں سکتے! وغیرہ وغیرہ۔ اور باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بیوی، بیاہ، سود بیاج گاؤں گھر اور بچوں کی باتیں سنانے لگا اور اب سب کچھ بھول کر ذوق و شوق سے کھانا کھا رہا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد اس نے اپنے میلے انگوچھے سے اپنا منہ پونچھا اور کچھ اس انداز سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا جیسے اس کا اُٹھنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ میری افسانہ نگاری کی رگ پھڑک رہی تھی۔

میں نے دوبارہ بات شروع کرنے کی خاطر پوچھا "تمہاری بیوی بھی چھٹّی پتر بھیجتی ہے؟"

"چھٹّی پتر بچاری کہاں سے بھیجے گی۔ گاؤں میں لکھنا آتا ہی کسے ہے؟ جب کوئی قرضے کا مارا بھوک کا ستایا جوان ادھر آتا ہے — انہیں آشاؤں کے ساتھ جو میں لے کر آیا تھا تو اس سے خیر خبر مل جاتی ہے۔ اور میرے دل کی آگ پھر سے بھڑک اُٹھتی ہے۔ وہ آگ جسے دن بھر محنت میں اور تمباکو میں بجھاتا رہتا ہوں مگر یہ یاد نہیں بھولتا بی بی جی۔ جب یہاں کی چمکتی سجی دوکانیں دیکھتا ہوں تو میرا کیسا جی چاہتا ہے۔ کہ اس میں سے ایک — بس ایک دھوتی خرید لوں اور اپنی بیوی کو لے جا کر پہناؤں۔ جب یہاں آیا تو آشا تھی کہ بہت سے پیسے کماؤں گا۔ اور اس کے لئے جھلمل جھلمل کرتے کپڑے اور سونے اور چاندی کے زیور ہونٹوں کی اور گلوں کی لالی اور اونچی اونچی جوتیاں اور بہت سی چیزیں اس کے لئے لے کر جاؤں گا تو وہ کتنی خوش ہو گی۔ میں اُسے اپنے ہاتھ سے سجاؤں گا۔ اسی طرح اس کا سنگار کروں گا جیسے یہ رکشا میں بیٹھ کر آنے والی ہوٹلوں میں مردوں

کے ساتھ ناچ کرنے والی استریاں کہتی ہیں۔ یا بولتی گاتی تصویریں کرتی ہیں۔ بی بی جی سینما کی پتلیاں کتنی سندر ہوتی ہیں۔ پر — پر میں اپنی استری کو ننگا نہیں پھراؤں گا۔ بی بی جی تمہارے دیس میں عورت کیسے کپڑے پہنتی ہے۔ آدھی سے زیادہ ننگی۔ بھگوان نہ کرے ہم گڑھ والیوں کی عورتیں ایسی بے شرم ہو جائیں۔"

شاید اس نے مجھے ان فیشن پرست تتلیوں سے مختلف دیکھ کر یہ سب کہنے کی جرأت کی تھی! مگر میں ان کی باتیں سُن کر شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ مہذب تعلیم یافتہ عورت کی فیشن پرستی پر اور نئے زمانے کی مغربی تہذیب پر جان دینے والی عورت کی بے حیائی پر — یہ جاہل، گنوار، غیر متمدن قلی تک اس کی حرکتوں کو باعث شرم سمجھتا ہے جسے وہ اتنی بھی اہمیت نہیں دیتی جتنی اپنے پالتو کتے یا بلی کو دیتی ہے! لیکن گو دینا و میرے احساسات سے بے خبر اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

"بی بی جی جب میں رات کو آدھے پیٹ کھانا کھا کر اپنے دوسرے ساتھیوں دس اور قلیوں کے ساتھ پیٹ میں گھٹنے دے کر اور بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے۔ جیسے میری عورت بالکل میرے پاس — بہت پاس ہو۔ کبھی کبھی تو اُس کا گرم گرم سانس تک محسوس ہونے لگتا ہے۔ ویسے ہی سندر کپڑے پہنے، ہونٹوں پر لالی لگائے، زیوروں سے سجی اونچا اونچا چیٹلا (جوڑا) باندھے — اس سمے مجھے وہ سندرتا کی اس رانی سے کہیں ادھک

سنار رنگتی ہے جو ہکمین اور سواتے ہیں ہر سال سر پر تاج رکھ کر اور ہاتھ میں چاندی کا پیالہ تھما کے مس مسوری بنائی جاتی ہے۔ جب کبھی یہ مس مسوری" میری رکشا پر بیٹھتی ہے تو میں یہی سوچا کرتا ہوں۔ کہ اگر میری رانی کو بھی یہی کپڑے زیور پہنا دیئے جائیں اور وہ بھی ایسا ہی سنگار کرے تو اس سے کہیں اچھی لگے اور پھر دن بھر کی تکان مجھے بہت جلدی سلا دیتی ہے۔ نیند کی دیوی ہم جیسے غریبوں پر بہت مہربان ہے۔ یہ ہاکی اور پیٹ کی آگ ہوتے ہوئے بھی وہ جلدی سے ہمیں اپنے سایہ میں لے لیتی ہے اور سپنوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ جہاں میری استری باہیں پھیلائے میری طرف دوڑتی ہے۔ بچے میری گود میں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور میں سپنے میں اپنے سورگ کے درشن کر لیتا ہوں پھر سویرے ہی مرغے کی بانگ لیتے کی آواز اور پیٹ کی بھوک جگا دیتی ہے تو یہ ماننے کو دل نہیں چاہتا کہ من کی دنیا سونی ہے۔ اور یہ سب مجھ سے ہزاروں کوس دور ہیں (اس کو گنتی کا اور فاصلہ کا کوئی احساس نہیں وہ سینکڑوں ہزاروں بے تکلف بولتا ہے) میں سوچتا ہوں میری استری اس وقت پنگھٹ پہ پانی بھر رہی ہوگی اور یہ ہاکا وہ گیت گا رہی ہوگی جو گڑھ والی عورت ہمیشہ سے گاتی آئی ہے۔ اس گیت کا رس اور مٹھاس، اس کا درد اور دکھ تم دیسی لوگ کیا سمجھ سکو گے۔" اسے تو صرف وہ عورت جان سکتی ہے جس کا پتی۔ اس سے سینکڑوں

برسوں سے دور ہو رہی گمنتی سے بے خبری ——— یا شاید وہ فراق کی شدت کو ہزاروں اور سینکڑوں کہہ کر ظاہر کرنا چاہتا ہو) اور غربت اور مصیبت کی ماری ہو اور زمیندار، برہمن اور افسروں کی جھڑکیاں کھاتی اور بیگار کرتی ہو۔ دکھ سہتی اور انتظار کرتی رہی ہو ......؟

- - - - - - - - - - - - - - -

یہ کہانی سُننے میں کیسی ہی بے کیف اور بے ربط معلوم ہو اس کے انداز بیان کی سادگی اور خلوص نے اُسے میرے لئے دلچسپ ناول اور حسین سے حسین رومان سے زیادہ پرکشش بنا دیا تھا۔ اگر ہنڈیا جلنے کی بو نے مجھے بیدار نہ کیا ہوتا تو جانے کب تک میں یونہی بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہتی۔ گوشت جل کر کباب ہو چکا تھا۔ شاید فراق کی آگ نے اسی طرح گوندو کی بیوی کی جوانی اور روپ کو بھسم کر ڈالا ہو۔ غربت اور مصیبت کی لپیٹ میں اس کی خوبصورتی اور خوش مزاجی جھلس گئی ہو؟ مگر کیا۔ کیا اس کا پریم ایسا ہی الٹ ہے یا مفلسی اور دوری نے اُسے بھی جلا ڈالا ہوگا؟ ایسا تو نہیں کہ اس گیایا کی "باوفا" بیوی کسی اور کے دل کی آگ بجھا رہی ہو گی؟ سانپ کی طرح رینگ کر یہ زہریلا خیال میرے ذہن میں گھس آیا۔ اگر۔ اگر ایسا ہوا ہوگا تو اس بدنصیب کی یہ مسرت۔ جس کے بل پر وہ یہ ساری کٹھنائیاں جھیل رہا ہے خاک میں مل جائے گی اس کا ناتوان دل اس صدمہ کو سہار بھی سکے گا۔

اور جب میں نے واپس آکر اس سے اپنے شبہ کا ڈرتے ڈرتے اظہار کیا تو اس کی آنکھیں غصّے اور جوش سے چمکنے لگیں، جھریوں بھرا چہرہ تن گیا۔ اور اس نے گڑھ والی عورت کی محبت اور وفا کی داستان سُنانی شروع کر دی اور باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بھٹی اور بے سری آواز میں ایک گڑھ والا گیت گانے لگا۔ یہ برہا کا وہ گیت تھا جو گڑھ والی حسینہ اپنے محبوب اور پی کے فراق میں گایا کرتی ہے۔ گیت کے بول رسیلے اور دل کش تھے اور ان کا مطلب جو اس نے مجھے بتایا وہ کچھ اس طرح کا تھا۔

او ساورے ہیتم جانے تو کہاں ہے؟ میں تو تجھے گہری ندیوں میں آوازیں دے کر ڈھونڈ رہی ہوں۔ میری کلائیوں پہ نگین چوڑیاں ہیں مگر ان کا کیا فائدہ۔ اب تو ہی بتا میں ان کو کس کی سیج کا سراہنا بناؤں گی؛ بھگوان کرے ساہوکار کا بیٹا مر جائے کیوں کہ اس کا بیاج بڑھ گیا۔ اور تم چلے گئے ہو۔ مگر یہ بتا دوں کہ اب کے بھی تم نہ آئے تو میں تھلی میں پھانسی لے کر مر جاؤں گی۔"

اس کی آواز میں نہ رسی تھا نہ ترنم مگر کچھ ایسا سوز تھا جو اس سے بھی بڑھ کر پر اثر ہوتا ہے۔ وہ گاتے گاتے رُک گیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "ارے بی بی جی بڑا نقصان ہو گیا دو گیٹ کا وقت نکل گیا۔ تم سے باتوں میں۔" اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پہاڑی سے پگڈنڈی سے نیچے کنک ریک کی طرف بھاگا جا رہا تھا اور جہاں وہ بیٹھا تھا اس جگہ میلی

ادر گندگی کا ایک چپتا پڑا تھا اور بد بو ابھی تک آرہی تھی یہ تعفن ۔ یہ داغ ۔ کیا آزاد ہندوستان کے ماتھے پر ایک دھبا نہیں ؟

ایک دن میں ٹہلتے ٹہلتے کلڑی بازار سے ہوتی یونہی ایک گلی میں گھس گئی شاید دیکھنا چاہتی تھی کہ ان چوڑی چوڑی پر رونق سڑکوں کے پہلو کی گلیاں کیسی ہیں ۔ گلی در گلی اور ہر طرف گندگی بدبو ، میلا ، کیچڑ ، گھورے کے ڈھیر ۔ ناکیاں اور گندے ۔ بیمار بچے جو اسی کیچڑ اور گھورے کے درمیان کھیل رہے تھے ۔ پل رہے تھے ۔۔ یہ بچے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے جیسے سوچ رہے ہیں کہ یہ کون جانور یہاں آگیا ۔ میں گھبرا کر یہاں سے مڑی ہی تھی کہ سامنے سے گووندو آتا دکھائی دیا ۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرہ پر پہلے استعجاب کے آثار ظاہر ہوئے ۔ اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ " بی بی جی تم یہاں کہاں ۔ اچھا اس دن تم نے کہا تھا تمہاری کوٹھری دیکھوں گی ۔ آؤ بی بی جی تمہیں اپنا محل دکھا دوں " اور دو تین گلیوں کا چکر دے کر وہ کوٹھریوں کی ایک لائن کے سامنے رک گیا اور ایک کوٹھری کے زدہ کواڑ جس کے رخنے ٹین کے ٹکڑوں سے بند کئے گئے تھے ، آہستہ سے کھول دیئے ۔ تعفن کا ایسا بھبکا آیا کہ میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئی ۔ یہ بارہ فٹ مربع کوٹھری تھی جس کے کونوں میں چند جھبھڑے نما کمبل اور لحاف پڑے تھے اور ایک

طرف کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن اور مٹی کے گھڑے رکھے تھے۔

"ہاں ہاں بی بی جی۔ یہیں اور میرے ساتھی ـــ نو ساتھی ـــ سب یہیں رہتے ہیں" میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں" تم دس آدمی اس کوٹھری میں رہتے ہو۔ اس میں تو دس جانور بھی نہیں بند رہ سکتے ـــ دس انسان کیسے اس میں رہتے ہو۔ وہ ہنسا ـــ زہر خندہ ہنسی" تم لوگ ـــ کوٹھیوں کے رہنے والے ـــ نہیں جان سکتے۔ میں بھی جب بھاری بکس اور بستر پیٹھ پر لاد کر ہوٹلوں اور کوٹھیوں کے بڑے بڑے شاندار کمروں میں سامان رکھنے جایا کرتا ہوں تو سچ مانو مجھے بھی بڑا اچرج ہوتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے محلوں میں ایسے اونچے اونچے کمروں میں تم ایک ایک یا دو آدمی کیسے رہتے ہو۔ جب۔ جب جہاں اگر ہم جیسے سیکڑوں ہزاروں بھی سوئیں تو جگہ بچ جائے۔ اور ہمارا جی گھبرا جائے اتنی بڑی جگہ سے۔"

اور تصویر میں میں نے دیکھا کہ دس انسان جن کو انسان کہنا انسانیت کا منہ چڑانا معلوم ہوتا ہے، جانوروں سے بدتر حالت میں رات کے سمے ایک دوسرے سے اسی طرح بھڑے ہوئے پڑے ہیں کہ کروٹ نہیں بدل سکتے۔ ٹانگیں نہیں پھیلا سکتے۔ ان کے جسموں کی بدبو ایک دوسرے کی ناک کی تواضع کر رہی ہے۔ ایک کے خراٹے دوسرے کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مچھر، کھٹمل اور پسو اور سفید و سیاہ جوئیں ایک کے

بستر سے دوسرے کے بستر کی طرف رینگ رہی ہیں تاکہ ان کا خون چوس سکیں جن

کی سرخی پہلے ہی حاکم، افسر، ساہوکار اور زمیندار چوس چکے ہیں اور اب

ان کی رگوں میں خالی پانی ہے۔ وہ بھی خالص نہیں گدلا میلا پانی — یہ

دس انسان۔ اور ان جیسے اور دیسیوں ہزار اپنے پھٹے کمبلوں میں محوخواب

ہیں۔ دن بھر کی محنت شاقہ نے انھیں تھپک تھپک کر سلا دیا ہے۔ سرمایہ داری

اور عیش پسندی کی کالی ماتا، تہذیب و تمدن، علم و آرٹ، شعر و ادب کی دیوی

سیاست کے ٹھیکیدار، حکومت کے ارباب حل و عقد کھڑے اس حسین نظارے

سے لطف اٹھا رہے ہیں! ہنس رہے ہیں۔ ان انسانوں کی بہیمیت پر!!

اور اس قہقہے کی خوفناک آواز برمے کی طرح میرے کان میں چبھی — میں

ایک جھٹکے کے ساتھ جیسے سوتے سے جاگ اٹھی۔ یہ قہقہہ۔ اس جانور نما

انسان۔ یا انسان نما جانور۔ کا تھا۔ جس کا نام گووندو تھا۔ جو بالا کہہ کر

بلایا جاتا تھا۔ جانے وہ کیوں ہنس رہا تھا۔ اس مہذب دنیا کی انسان دوستی

پر یا مہذب انسانوں کی بہیمیت پر یا اپنی حالت پر۔

واپسی میں راستہ میں اس نے کہا — گووندو۔ کچھ اور حال سناؤ

اپنے ہال کا۔ تو اس نے کچھ عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور گردن

جھکالی۔ یہ نظریں کہتی معلوم ہو رہی تھیں کہ تم آخر اور کیا پوچھنا چاہتی ہو

ہماری زندگی میں آخر کونسی ایسی بات ہے جو تمہارے لیے کشش ہوگی۔

ہماری عورت محبت کے الاؤ اور فراق کی آگ میں جلا کرتی ہے۔ اس کو تم شہر کی عورت کیا سمجھو گی! اور اس سے کیا لطف لو گی! تم خیالی دنیا میں بساؤ رنگین کہانیاں لکھو، رومانی افسانے سناؤ۔ تم کیا جانو تمہارے دیس کے لاکھوں باسی اب تک کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ مفلسی جہالت۔ گندگی، بھوک، محنت اور ذلت کے بھنور میں پڑے ہیں۔ بسک رہے ہیں؟ نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔ سود در سود کا چکر۔ رشوت کی گرم بازاری، خودساختہ رہنماؤں کی بے دیانتی، قوم کے خیر خواہوں کی بے عملی یا سہل انگاری کی چکی انھیں پیس رہی ہے۔ جن کا ماضی تاریک تھا جن کا حال تاریک ہے۔ اور جن کا مستقبل کون جانے؟

وہ اور میں دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سیاہی میں بدل رہا تھا۔ نیچے دور ڈیرہ دون کی لاکھوں روشنیاں چمک رہی تھیں اور آسمان پر کروڑوں تارے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ امید کے منارے کی روشنی کی طرح یہ روشنیاں کبھی ابھرتی تھیں کبھی ڈوب جاتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر جیسے اپنے دیس کے روشن مستقبل کے لئے آشا کی ایک کرن میرے دل میں پھوٹی۔

ٹبلا میرا گھر آنے پر سلام کر کے خاموش واپس جانے کو مڑا۔ اور چند سیکنڈ بعد اس نے ایک پہاڑی گیت زور شور سے گانا شروع کر دیا۔ بہار کا

گیت "جھمیلو"

توکولڑی آئی نے ہے جھمیلو ۔۔۔ وائی کوسی پھیو ہے جھمیلو
پھول گییں بنوں ہے جھمیلو ۔۔۔ گوہراں ۔ براس ہے جھمیلو
چھتیا لی ڈالیوں ہے جھمیلو ۔۔۔ گوگھگتی گھوری ہے جھمیلو
گوری ننگد نیو ہے جھمیلو ۔۔۔ میلوڑی باسلو ہے جھمیلو

نئی رات چکر کاٹ کر پھر لوٹ آئی ہے ۔ جنگل میں چاروں طرف خاک آلود درازوں میں گوہراں اور براس کے رنگ برنگے پھول نکل آئے ہیں ۔ درختوں کی جھومتی ہوئی شاخوں پر گھگھی سریلا راگ گا رہی ہے ۔ وادی کے دوسری طرف گہری ندیوں اور ہر طوری بھی ہجر و وصال کے دکھ بھرے نغمے گا رہی ہے ۔ اس کی آواز دھیرے دھیرے دھیمی پڑتی گئی اور آخر فضا میں ڈوب گئی ۔

سہاگ رات

چھُن چھن، چھم، چھم، چُرمُر...... آگے آگے واقعی لال چھینٹ کا گھوم دار لہنگا پہنے، جس کی گوٹ پر پٹے کی تیلی سی تحریر سورج کے کرنوں سے دمک اٹھتی تھی۔ نقلی ریشم کا جھلملاتا ہوا سبز کرتا جس کے گریبان میں چاندی کے بٹنوں کی لٹکتی ہوئی زنجیروں کے گھونگرو مسلسل بج رہے تھے۔ اور اس کے چندن ہار کی تڑیوں سے بار بار اُلجھ کر اس کے سینے پر لوٹنے لگتے تھے۔ جاپانی ریشم کا گلابی دھاری دار دوپٹہ جو چادر اور دوپٹہ دونوں کا کام دے رہا تھا اور اگرچہ اس کے شرمائے گھبرائے مکھڑے کو چھپانے میں کامیاب تھا لیکن پیٹھ اور سینے پر سے پھسل کر ندیدے مسافروں کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ وہ گھبرا کر ہر بار اپنے مہندی لگے سانولے ہاتھوں سے جو چاندی کے پری بند، بتانوں، کڑوں اور شیشے کی ہری لال چوڑیوں سے کہنی تک بھرے ہوئے تھے، دوپٹے کو سنبھالتی تو جھنکار کی ایک بڑی خوشگوار آواز فضا

میں بکھر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے والا نوجوان دولہا، بار بار پلٹ کر کڑے تیوروں سے للچائی نگاہوں کو دیکھتا اور پھر اپنی دولہن کے ساتھ آگے بڑھ جاتا۔ اس کے پاؤں میں لال نری کا نیا جوتا بری طرح چبھ رہا تھا، اور نقلی ریشم کا گلابی کرتا پسینے سے شرابور ہو کر اس کے چوڑے چکلے سینے پر چپک گیا تھا اور لال کناری کی کوری دھوتی پیر میں الجھ الجھ جاتی تھی۔

وہ اس وقت بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ اوّل تو گاڑھے کی چھوٹی سی دھوتی باندھ کر ننگے بدن مئی جون کی لو میں گھومنے والا نوجوان جس کے چوڑے چوڑے پاؤں جوتوں کی منت سے ہمیشہ آزاد رہے تھے، ان غیر مانوس چیزوں سے پریشان ہوا جا رہا تھا۔ اور پھر نئی ذمّہ داری کا احساس جیسے اُسے دبائے ہوئے تھا۔ یہ نئی نویلی دلہن کہیں بھیڑ بھڑکّے میں کھو نہ جائے، یہ خوف اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ بہو اسی طرح سر جھکائے گھونگھٹ کاڑھے اس کے پاؤں کو دیکھتی پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ اپنی بہو کا گدرایا ہُوا سندر ہاتھ تھام لے اور اُسے ساتھ ساتھ لے کر چلے۔ یہاں کون ہے دیکھنے والا بھلا؟ لیکن اتنی بڑی جرأت وہ نہ کر سکا۔ اگر کسی گاؤں والے نے دیکھ لیا تو؟ پھر یہ سب مسافر — یہ کیا کہیں گے؟ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے سب کے سب بس اسی کو گھور رہے ہیں اور اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس

کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک بار اس نے بڑی ہمت کر کے اپنا سخت چوڑا مضبوط ہاتھ بہو کے چھوٹے سے پیارے سے ہاتھ کی طرف بڑھایا بھی۔ اُسے ڈر کس کا ہے آخر؟ وہ پنچوں کے بیچ میں بھگوان کو گواہ کر کے اُسے بیاہ کر لایا ہے — وہ اس کی ہے — صرف اس کی۔ پر بہو اس طرح ٹھٹک کر اور سہم کر پیچھے ہٹی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو اور ایسے خائف انداز میں گھونگھٹ کی آڑ سے اُسے دیکھا کہ اس کی ساری جرأت ہوا ہو گئی اور خود اس کا نوجوان چہرہ شرم سے تانبے کی طرح لال ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں، گھر کی بند کوٹھری کے اندر وہ اس کی ہے۔ پر یہ دن دہاڑے کیسے نئی دُلہن اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر چلنے لگی — بھگوان نہ کرے وہ کوئی میم صاحب ہے؟ رامو نے بہو کے یہ خیالات آپ سے آپ پڑھ لئے اور وہ جھینپے انداز میں پھر اُس سے دو قدم آگے آگے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اس پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ جہاں اس کے گاؤں کی طرف جانے والی ٹرین آ کر کھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس نے ایک طرف دیوار کے سہارے اپنی بہو کا چھوٹا سا نیلا ٹرنک اور بستر کی پوٹلی رکھ دی اور اس پر بہو کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود دو قدم ہٹ کر بیٹھ گیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا!

اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ جانے خوشی سے کہ سفر کے خوف سے جتنی بار اس کی نظر گھونگھٹ میں سر جھکائے بہو کی طرف اٹھی

اس کا دل اب بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ وہ کوشش کر کے اپنی نظریں اُدھر سے ہٹا لیتا تو ان چہروں کو دیکھ کر جھنجھلا اٹھتا جو ہمیشہ کسی نئے دولہا دولہن کو دیکھ کر مسکراتے اور مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگتا تو گھر کا دھیان آجاتا۔" آج گھر پر سب کتنے خوش ہوں گے۔ بڑی بہن اپنے بیاہ کا جوڑا پہننے میں مصروف ہو گی اور چھوٹا بھائی سارے گاؤں میں گھوما گھوما ناچا ناچا پھر رہا ہو گا۔ بہو آئے گی۔ بہو آئے گی۔ سب کے منہ سے بس یہی نکل رہا ہو گا۔ اور ماں۔ ماں کی خوشی کا تو بس کوئی ٹھکانا ہی نہ ہو گا! آدھی رات سے کام میں جتی ہو گی۔ میری کوٹھری کی لیپ پوت کو چندن سا کر دیا ہو گا! میٹھے تیل کی پوریاں، آلو کی بھاجی اور آٹے کا حلوا بنایا ہو گا۔ ماں نے میرے اور بہو کے لئے۔ اس دن کہہ رہی تھی نا کہ جس دن رامو بہو کو لے کر آوے گا حلوہ پوری پکاؤں گی۔ کوئی اسٹیشن پر لینے بھی ضرور آوے گا۔ منگلو، کلو اور رمضو چاچا ضرور سے ضرور آویں گے۔ شامو بھی ضد کر رہا ہوں گا۔ ماں میں بھیا اور بھاوج کو لینے اسٹیشن جاؤں گا۔ اور سارا گھر بھرا ہو گا۔ آج تو۔ گاؤں بھر کی لونڈیاں لار ہیاں مل کر گا بجا رہی ہوں گی۔ جانے ماں نے میری نئی کھاٹ کوٹھری میں بچھائی ہو گی یا نہیں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ارے توبہ جب وہ ہاٹ والے دن لال لال پاؤں والی کھاٹ لے کر آیا تو گاؤں کی چنچل بہوؤں نے دیور کے ناتے کتنا ستایا تھا اسے۔

کتنا چھیڑا تھا کہ وہ رو پڑا تھا۔ پر کتنا مزا آوے ہے اس چھیڑ چھاڑ میں بھی۔ اور پھر سسرال میں سالیاں۔ بھگوان بچائے ان آفت کی پڑیوں سے۔ ساری کی ساری مل کر اس کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ چنچل۔ ہنسوڑ۔ پان کھلایا تو مار کے مرچیں بھر ڈالیں۔ حلوا لائیں تو۔ آخ تھو۔ پڑی مٹی ہی مٹی اور بیڑی کے بہانے جلنے کیا بلا پلا دی کہ سارا منہ کڑوا ہو گیا۔ اور ہنسے جا رہی ہیں۔ باؤلیوں کی طرح۔ اچھے خاصے بھلے مانس کو الّو بنا کر چھوڑ دیں۔ غیر مرد سے مسخری کرتے انھیں لاج بھی نہ آوے ہے۔ پر غیر کیوں ہوا۔ اب تو وہ ان کا جیجا جی ہے نا۔ کیا پیارا لگے ہے ان کے منہ سے جیجا جی۔ جیجا جی —— اور اس نام کی مٹھاس جیسے اسے اپنی زبان کی نوک پر محسوس ہونے لگی —" وہ گوری گوری جوان چھوکری جانے کون تھی جو میرے برابر کھڑی برابر چھیڑ رہی تھی اور ہنسے جا رہی تھی ہنسنے سے اس کے گلے کیسے لال لال ہو گئے تھے اور نتھ اس کے مکھ پر کیسی شوبھا دے رہی تھی! اونہہ —— مجھے کیا —— پرائی بہو بیٹیوں کو تاکنا شریفوں کا کام نہیں ——" اور اس کی نظر پھر لاجو کی طرف اٹھ گئی۔ جس کے گلابی دوپٹے میں سے کانوں کے جھمکے اور بالیاں باہر جھانک رہی تھیں اور گرمی سے تمتمائے چہرہ کا ایک حصہ گھونگھٹ کی ریخ میں سے نظر آ رہا تھا اور وہ گھونگھٹ کا ذرا سا کونا اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اچھے بھر کے لئے دونوں کی نظریں ملیں۔ بجلی چمکی اور پھر

چاند بدلی میں چھپ گیا! لاجو نے شرما کر گھونگھٹ اور لمبا کر لیا۔ گردن اور زیادہ جھکا دی۔ رامو کا دل مسرت سے بھرپور ہو گیا۔ اس کی لاجو کیا کسی سے کم ہے۔ نہ سہی گوری۔ پھر بھی کتنی سُندر ہے۔ اور پچھلے سال کا سارا منظر اس کی نظروں تلے گھوم گیا۔

وہ اپنے چاچا کے ہاں جا رہا تھا۔ کہ راستے میں سسرال کا گاؤں پڑا۔ اور وہ یونہی اس کے گاؤں چلا گیا۔ سویرے کا وقت تھا۔ گاؤں سے باہر پنگھٹ پہ آٹھ دس جوان عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ ڈول کھینچتے ہوئے ایک ساتھ ان کے لچکیلے بدن آگے اور پیچھے کو جھکتے تھے۔ اور رنگ برنگی اوڑھنیاں ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اور کانوں۔ گلوں اور ہاتھوں کے زیور بج رہے تھے! ان کے سریلے گلوں سے ایک مدھ بھرا گیت فضا میں بکھر رہا تھا۔ اور یہ ساری چیزیں ایسا سندر سماں پیش کر رہی تھیں رامو کو لگا کہ وہ کسی پرستان میں پہنچ گیا ہے۔ کتنی دیر وہ ایک پیڑ کی آڑ میں کھڑا اس حسین منظر کو دیکھتا رہا۔ جب پانی بھرنے کے بعد ان سبنے اپنی اپنی گاگریں اٹھائیں اور رسی ڈول سنبھالا تو وہ ایک دم آڑ سے نکل کر سامنے آگیا اور بولا بڑی پیاس لگی ہے۔ کوئی مسافر کو پانی پلا دے، کئی عورتوں نے ایک ساتھ اپنی مٹکیاں جھکائیں اس نے سب سے آگے کی ایک پندرہ سولہ برس کی سانولی سلونی گدرائے بدن والی چھوکری کے سامنے اپنا

چلّو کر دیا جس نے اپنی موٹی موٹی کالی آنکھوں سے ایک بار مسافر کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر مٹکی کا منہ جھکا دیا۔ رامو کی نظر لڑکی کے چہرے پر جمی ہوئی تھی اور چلّو میں سے پانی زمین پر گرتا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے ایک دو ہتھڑ لڑکی کی پیٹھ پہ مار کر کہا۔ "اری لاجو۔ کمبخت ۔۔۔ یہ تو تیرا دولہا ہے۔ رامو۔۔۔" لڑکی ایک پل کے لئے ٹھٹکی اور پھر گھڑا پھینک، دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا چوکڑیاں بھرتی گاؤں کی طرف بھاگ گئی۔ گھڑا رامو کے سر سے چھوتا اور بے ارادے اُسے نہلاتا ہوا اس کے پیروں کے پاس گر کر پھوٹ گیا اور پنگھٹ کی چنچل ناریوں کے نقرئی قہقہے فضا میں گونجنے لگے اور انھوں نے اُسے اپنے حلقے میں لے کر بنانا شروع کر دیا۔ کتنی مشکل سے وہ ان سے پیچھا چھڑا کر بھاگا تھا اور گاؤں سے باہر تک ان کی ہنسی کی آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔ راستے بھر لاجو کا سندر چہرہ، موٹی موٹی آنکھیں اور شرم سے تمتماتے سرخ سرخ گال اس کی نظروں میں گھومتے رہے۔ اور پھر کتنی راتوں کو لاجو نے سپنے میں آکر رامو کا دل بہلایا تھا۔ اس کی آغوش میں مچلی تھی۔ اُسے پریم کا سندیسہ سنایا تھا۔ اس کی آس بندھائی تھی کہ کیوں گھبراتا ہے۔ لاجو تیری ہے۔ صرف تیری۔ ایک دن سچ مچ تیرے پاس آجائے گی ۔۔۔ ایک برس تک رامو لاجو کا گونا کرا کے گھر نہ لا سکا۔ اور یہ ایک برس اُسے دس برس کے برابر ہو گیا۔ پچھلے

سال سوکھا پڑنے سے ساری فصل خراب ہو گئی تھی! جو تھوڑا بہت غلّہ پیدا ہوا وہ بنئے کے گھر لگان میں اور رشوتوں میں چلا گیا اور رامو کو اپنا اور اپنی ماں بہن اور بھائی کا پیٹ بھرنا دوبھر ہو گیا چھ مہینے تک انھوں نے ایک سمے بھوکا رہ کر اور دوسرے وقت روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کیا تھا!

آخر بھگوان کی کرپا سے ربیع کی فصل اچھی ہوئی اور بڑی مشکل سے رامو نے اتنا پیسہ جوڑا کہ بہو کا گونا کر کے لے آئے۔

ریل کی سیٹی کی تیز آواز رامو کے کانوں میں گونجی اور وہ جیسے سوتے سے چونک پڑا "اٹھ ری — جلدی کر" اس نے گھبرا کر لاجو سے کہا اور جلدی سے اس کا ٹرنک کندھے پہ رکھ پوٹلا ہاتھ میں لٹکاتا، کرتے کی جیب میں ٹکٹ ٹٹولتا اور لاجو کے لئے بھیڑ میں رستہ بناتا وہ گاڑی کی طرف لپکا۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔ دوڑنے کے باوجود انھیں کسی بھی تھرڈ کلاس ڈبّے میں جگہ نہ مل سکی۔ بیٹھنا یا کھڑا ہونا کیا اندر گھسنے کی جگہ نہ تھی۔ لاجو اس وقت ساری لاج بھولے، گھونگھٹ سر پر ڈالے، منھ پہ ہوائیاں پسینے میں شرابور، رامو کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اسے ہر دم یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں بھیڑ میں وہ اس سے بچھڑ نہ جائے۔

جب گاڑی نے روانگی کی سیٹی دے دی تو رامو کے ہاتھ پیر اور بھی

بھول گئے۔" ہے بھگوان گاڑی چھوٹ گئی تو نہیں ہو کہ رہ کر کہاں جاؤں گا؟ گھر پر سب کتنے پریشان ہوں گے۔ ماں رو رو کر مر جائے گی۔ بہن اور بھائی گھبرائے گھبرائے پھریں گے۔ نہیں۔ چلنا تو ہی ہے۔" اس نے لاجو کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور ایک انٹر کلاس کے ڈبّے میں جہاں پہلے ہی سے آدمی بھرے تھے گھسنے لگا۔ پھر سنتہ نہ ملا۔ اس نے جھلا کر گٹھری کھڑکی میں سے اندر پھینک دی۔ اور لاجو کو ہاتھ کا سہارا دے کر ڈبّے میں ڈھکیل دیا۔ وہ اوندھے منہ کچاکچ بھرے مسافروں پر گری۔ جلدی سے ایک نوجوان نے جو پتلون اور بش شرٹ پہنے، منہ میں ایک خاص اسٹائل سے سگریٹ دبائے، راجکپور کے انداز سے ماتھے پر بال ڈالے تھا، لاجو کو سہارا دے کر کھڑا کیا ایک سیٹی کی سی آواز اس کے منہ سے نکلی اور ساتھ ہی "اوہ گاش —— ہاؤ سپریٹی —" اور ڈبّے بھر کی نظریں لاجو کے تمتمائے چہرے پر تھیں —— ساتھ ہی گاڑی نے دھیرے دھیرے رینگنا شروع کر دیا۔

ان لالچی بد نظر مردوں کے بیچ میں وہ نئی نویلی دلہن اکیلی کھڑی تھی۔ اور اس کے عصمت کنوارے چہرے پر ان کی ندیدی نظریں سوئیوں کی نوکوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ باہر اس کا بدحواس دولہا اندر گھسنے کی کوشش میں ناکام ہو کر گالیاں بک رہا تھا —— ایک لمحے کے لئے لاجو بوکھلا گئی۔ اب کیا ہوگا؟ مگر اسے فیصلہ کرتے دیر نہ لگی۔ اس نے لپک کر اپنی گٹھری اٹھا

کر کھڑکی سے باہر پھینکی اور اپنے مضبوط ہاتھوں اور کہنیوں سے نازک اندام نوجوان اور تھل تھل کرتے موٹے جسموں کو دھکے دیتی اور کڑی نظروں سے ان کو گھورتی ہوئی گاؤں کی یہ صحت مند اور نڈر بیٹی ڈبے کے دروازے تک پہنچ گئی ـــ رامو گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اندر اور باہر سب ہنس رہے تھے۔ بے حس۔ بے درد لوگ جو کسی کی مصیبت پر صرف ہنس سکتے ہیں۔ لاجو کی تیوری پر بل آ گئے۔ اور دوسرے لمحے وہ چلتی ہوئی گاڑی سے باہر رامو کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں پڑی تھی۔ ہنسنے والوں کی ہنسی رک گئی۔ بھاگتی گاڑی کے مسافر اور اسٹیشن پر کھڑے ہوئے لوگ سب اس کم سن لڑکی کی ہمت پر حیران رہ گئے۔ رامو نے لاجو پر جھک کر گھبرائے لہجے میں پوچھا "چوٹ تو نہیں لگی میری رانی؟" اور رانی جو دل پر زور کا دھچکا لگنے سے نیم بے ہوش سی ہو گئی اور اس عالم میں یہ بھول گئی تھی کہ وہ سینکڑوں کے مجمع میں کس حال میں ہے۔ ایک دم تڑپ کر رامو کے بازوؤں سے نکلی اور لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر سر جھکا اس انداز سے کھڑی ہو گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ پسینے میں نہائے، بدحواس رامو کے چہرے پر یہ دیکھ کر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ کتنی بہادر، کتنی ہمت والی اور پھر بھی کتنی شرمیلی ہے اس کی لاجو۔

رات گہری ہو چلی تھی۔ اسٹیشن پر بجلی کی بہت سی بتیاں جگمگا

رہی تھیں۔ مسافروں کا ہجوم کم ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ اب صبح سے پہلے کسی گاڑی کے جانے کا وقت نہ تھا۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا تھرڈ کلاس کے مسافر پلیٹ فارم پر لیٹے یا بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ فضا خاموش اور اداس تھی۔

رامو نے روشنی سے دور ایک ذرا اندھیرے کونے میں ایک لکڑی کے بنچ پر لاجو کی ہری لال دری بچھا دی تھی اور سرہانے اس کا چھوٹا سا لال تکیہ رکھ کر گویا اس کے لیے سیج تیار کر دی تھی اور اس سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ اس پر لیٹ کر سو جائے۔ پر وہ اسی طرح زمین پر بیٹھی تھی اور شرم سے اور بھی سکڑی جا رہی تھی۔ کئی بار کہنے کے بعد رامو کو غصہ آ گیا۔ اسی طرح اس نے پوری بھاجی کھاتے ہوئے شرم کی اور بھوکی رہی۔ اب وہ چاہے ہے کہ ساری رات یونہی زمین پر بیٹھی رہے۔ "تو میرا کہنا نہیں سنے گی؟" اس نے ذرا سختی سے کہا تو لاجو سہم گئی اس نے دھیرے سے کہا "وہ اُدھر۔۔۔آدمی گھوم رہے ہیں۔"

رامو کو اس کے بھولے پن پر پیار آ گیا "ارے تو گھومنے دے" وہ زور سے ہنس کر بولا "اب کیا تیرے لئے سب یہاں سے چلے جاویں؟ تو میرے دل کی رانی سہی پر ملکہ وکٹوریا تو نہیں ہے۔" اور لاجو جھجکتے ہوئے بنچ کے سرے پر بیٹھ گئی اور رامو بنچ کے پاس کھسک آیا اور اسے دیکھنے لگا!

ایک سپاہی ہاتھ میں ڈنڈا لئے گھومتا ہوا اُدھر سے گزرا اور ان دونوں

کو بڑھی بڑھی نظروں سے گھورنے لگا! لاجو نے جیسے ان دیکھے اس کی بدنظری کو محسوس کر لیا اور بے کل سی ہو گئی۔ رامو نے اُسے دیکھا تو شرما سا گیا، "کاہے یہ کمبخت میری بہو کو گھور رہا ہے۔" پر یہ خیال تو اُسے بھول کر بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی اس پر شبہ بھی کر سکتا ہے۔ جب دو منٹ بعد واپس آکر سپاہی نے اُسے ڈانٹا "اے کون ہے تو۔ اور یہ کسی کی مہریا کو بھگا کر لایا ہے؟" تو رامو کے جیسے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اس کی تیوریاں بدلیں، جسم کا ریشہ ریشہ کانپا، رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے کڑک کر کہا "حولدار جی حواس میں رہنا ذرا۔ میں اپنی بہو کا گونا کر کے لایا ہوں گاڑی میں جگہ نہ ملی تو یہاں رہنا پڑا۔ شرم نہیں آتی پاپ لگاتے۔"

"ارے جا جا۔ بہت دیکھے ہیں بہو والے۔ چل۔ چل تھانے" سپاہی نے دھمکی دی "بڑا آیا تھانے لے جانے والا۔ ذرا جبان سنبھال کر بول، نہیں تو پھر تو جانے گا۔ رامو نے گاؤں کے اکھاڑے کی کتنی کُشتیاں جیتی ہیں اپنے استاد کے صدقہ میں تجھ جیسوں کو تو یُوں۔۔" باہوں کو بل دے کر، "یوں اڑا سکوں ہوں"۔ سپاہی گھبرا سا گیا۔ پہ حکوت کا گھمنڈ اتنی آسانی سے جانے والا نہ تھا۔ "جا جا ایسی گیدڑ بھپکیاں اور کسی کو دے۔ بجتو۔ بھگا لایا ہے کسی بھلے گھر کی لونڈیا کو۔ چل ری لڑکی میرے ساتھ۔"

اور رامو اتنے زور سے دہاڑا کہ ادھر لاجو اچھل پڑی اور ادھر اسٹیشن

کے سارے لوگ دوڑ پڑے کہ کیا ہوا۔ دیکھا تو رامو سپاہی کو دبائے بیٹھا ہے۔ کئی آدمیوں نے بیچ بچاؤ کر کے سپاہی کو اس کی گرفت سے چھڑایا۔ رامو نے غصے میں ساری رام کہانی لوگوں کو سنائی، تو سب کی ہمدردی اس کے ساتھ ہو گئی۔ اُسے گاڑی سے رہنے اور لاجو کو دتے خود اسٹیشن ماسٹر تک نے دیکھا اور اس سپاہی کی بدمعاشی سے بھی اسٹیشن کے عملے کے لوگ واقف تھے اور جب رامو نے معصومیت کے ساتھ کہا "چلو جی تم سب ابھی میرے ساتھ۔ آٹھ ہی کوس تو ہے میری سسرال یہاں سے۔ میں وہاں ہزار گواہیاں دلا دوں گا کہ میں آج بہو کو بیاہ کر لایا ہوں"۔ تو سب کو ہی اس کی سچائی پر یقین آ گیا اور سپاہی پر لعن طعن ہونے لگی۔ اسٹیشن ماسٹر نے سپاہی کو ڈانٹا۔ رامو کا غصہ ٹھنڈا کیا اور تھوڑی دیر بعد لاجو اور رامو پھر اپنے "گوشۂ عافیت" میں تنہا تھے۔ لاجو بچاری بدحواس تھی! ایک ہی دن میں اس پر کتنی مصیبتیں پڑی تھیں۔ پیر چھوٹا، ماں باپ سکھی، سہیلیاں، بچھڑیں۔ گاڑی نہ ملی۔ اسٹیشن پر رہنا پڑا اور یہ موا بدمعاش شریف بہو بیٹیوں کو پاپ لگانے والا۔ مر جائے موا۔ پر اس کا رامو ... اس کا پتی بھی کیسا شیر دل ہے۔ حوالدار جی کیسے ڈر کر بھاگے ہیں۔ گیدڑ کہیں کا۔ کیسا بہادر ہے۔ اور کتنا سندر ہے۔ اس کا رامو ... لاجو کی نیند سے بوجھل اور حیا سے جھکی نظریں جن میں محبت کی پہلی بجلی کوند رہی تھی اٹھیں اور رامو کی پر شوق نظروں سے مل کر پھر جھک

گئیں۔ رامو نے دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور سرگوشی کے انداز میں بولا "تو ڈری تو نہیں میری رانی، جب تک تیرا رامو زندہ ہے مجال ہے کسی کی کہ میری لاجو کو بری نظر سے دیکھے!"

اور جانے کتنی رات تک وہ اپنے بھائی بہنوں اور ماں کی باتیں اپنے یار دوستوں کے قصے، اپنی بہادری کے کارنامے اسے سناتا رہا۔ اور پھر اپنی پریم کہانی بھی شرما شرما کر بیٹھے سر میں اسے سنا ڈالی۔ کبھی کبھی ایک میٹھی لجائی ہنسی یا دبی اور تھکی آواز اس کی ان تھک گفتگو کا سلسلہ توڑ دیتی تو وہ بڑے شوق سے اسے سننے لگتا۔

اس رات .... صبح صادق سے کچھ پہلے، جب ستارہ سحری پوری آب و تاب سے آسمان پر جلوہ گر ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے کونے میں ایک بنچ کا سہارا لیے بیس اکیس برس کا ایک نوجوان بیٹھا بیٹھا سو رہا ہے۔ اس کا سر لڑھک کر اس کے کندھے پر جھک آیا ہے۔ ٹانگیں بنچ سے نیچے لٹک رہی ہیں اور اس کے زانوں پر ایک بھولے بھالے سندر چہرے والی کم سن دوشیزہ کا سر رکھا ہوا ہے۔ جس کا ایک ہاتھ زمین کو چھو رہا ہے۔ نشیلی آنکھیں جوانی کی مست نیند سے بند ہیں۔ لیکن معصوم ادھ کھلے ہونٹوں پر دل کش مسکراہٹ کھیل رہی ہے جیسے کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہو۔

اس حسین و معصوم منظر کو دیکھ کر ستارۂ سحر مسکرا پڑا۔ جس سے اس کی آب و تاب اور بھی بڑھ گئی اور پھر ایسا معلوم ہُوا جیسے اس کی آنکھ بھی جھپک گئی ہو۔

بابا

نہ جانے ان میں اتنی مٹھاس کہاں سے آ گئی تھی!

پروانوں کو شمع سے شاید اتنا پیار نہ ہو، اتنی بے قراری سے اس پر نہ گرتے ہوں جس طرح بچے ان پر گرتے تھے۔ شہد کے چھتے کے گرد مکھیوں کے ہجوم کی طرح بچے ہمیشہ ان کے چاروں طرف بھنبھناتے رہتے تھے۔

"نئیں نئیں —— میں دال روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

ایک گھنٹے سے اسے یہی رٹ لگی ہوئی تھی۔ دال روٹی نہیں گوشت کھاؤں گا۔ ماں سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی تھی۔ آخر ماں کا صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور اس نے دو چانٹے زور زور سے اس کے پھولے پھولے سرخ گالوں پر جما دیئے۔ بچہ زمین پر لوٹ گیا۔ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زور زور سے رونے لگا۔ قدموں کی چاپ ہوئی اور ماں بیٹے دونوں سہم گئے۔ ماں ڈری کہ انھیں

پتہ چلے گا کہ میں نے ننھے کو مارا ہے تو ڈانٹیں گے۔ بچّہ نے بھی سر گھمایا۔ بابا آ رہے ہیں۔ وہ تیزی سے زمین سے اٹھا اور اپنے کو جھاڑتے اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا "تب سے کہہ رہا ہوں تھاؤں گا تھاؤں گا لاؤ روٹی لاؤ۔"
وہ دروازے سے لپکے آئے اور بچّے کو گود میں اٹھا لیا "کس نے مارا۔ میرے بیٹے کو؟" ماں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ بچّے نے بابا کے کندھے میں منہ چھپا کر کہا "بابا امّاں نے بہت جور سے مارا" بابا نے غصّے سے ماں کو گھورا۔ کیوں مارا تم نے اسے —— اچھا میں بھی تمہارا گھر دھوپ میں بنا دوں گا۔"

"بابا" ماں نے کہا۔ وہ تو سبھی کے بابا تھے نا "گھنٹہ بھر سے ضد کئے جا رہا ہے کہ گوشت کھاؤں گا۔ اب گوشت نہیں تو کیا میں اپنی بوٹیاں کھلا دوں؟"

"میرا بیٹا کبھی ضد نہیں کرتا —— تم جھوٹ بولتی ہو۔ کیوں منّے؟"

"ہاں بابا میں دال روٹی کھاؤں —— اور گڑ۔"

"ہاں ہمارا نواب بیٹا دال روٹی کھائے گا اور گڑ —— لاؤ میرے اور اس کے لئے کھانا۔"

اور منٹ بھر پہلے کا شیطان، نیکی کا فرشتہ بنا، بابا کے ساتھ مزے سے کھانا کھا رہا تھا۔ بابا کے ساتھ کھانا کھانے کی خوشی میں دال کی بدمزگی اور گالوں کی جلن غائب ہو گئی تھی اور وہ فخر سے دوسرے بچّوں کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ صرف امّی پر منحصر نہ تھا۔ خاندان اور محلّے بھر کے بچّے ان کا ہر حکم

بے چون و چرا مانتے تھے۔ ان کے پاؤں کی چاپ سنتے ہی جو جہاں ہوتا سنبھل جاتا۔ ننگی ٹانگوں پھرنے والی بچّی ماں سے کہتی "پاجامہ پہنا دو نا۔ بابا آرہے ہیں"۔

مٹّی کھاتا ہوا بچّہ ہاتھ منہ پونچھ کر بڑا پاکباز بن جاتا۔ کھیلنے پر ضدیں بند ہو جاتیں۔ جوتے پہن لئے جاتے، منہ دُھلنے لگتے۔ سبق یاد ہونے لگتے۔ ہر بچّہ کی کوشش ہوتی تھی کہ بابا کی توجہ اور تحسین حاصل کر سکے۔ کوئی کندھے پر سوار ہو جاتا کوئی گود میں چڑھ جاتا۔ ایک گھٹنے سے لگا کھڑا ہے دوسرا گھٹنیوں چلنے والا کھسک کھسک کر اُس کے پاس چلا آرہا ہے۔ گود کے ننھے بچے بھی ہمک ہمک کر ان کو لبھانے لگتے۔ بڑے بچّوں میں سے ایک چلّاتا "بابا میں نے سبق یاد کر لیا، آگے پڑھا دیجئے"۔ دوسرا اپنی فوقیت جتاتا "بابا میں نے آگے کا سبق خود ہی پڑھ ڈالا۔ اور تختی بھی لکھ ڈالی ہے"۔ وہ سب کو پیار کرتے سب کی باتیں سنتے سب کو مطمئن کر دیتے۔ ضدّی سے ضدّی، شوخ سے شوخ بدتمیز سے بدتمیز بچّہ ان کو دیکھتے ہی نیکی کے جون میں آجاتا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ ان کے پاس آتے ہی بچّے کی فطری معصومیت اندر سے زور مار کر باہر نکل آتی تھی۔ بچّوں کی کثرت سے نالاں اور بیزار مائیں اپنے بچّوں کو ان کے پاس ہی تربیت اور تنبیہہ کے لئے لاتی تھیں۔ اکلوتے لاڈلے بگڑے ہوئے بچّے بھی اصلاح کے لئے ان ہی کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ بے توجہی اور سختی

کا شکار نفسی مریض لڑکے لڑکیاں بھی آخر میں مجبور ہو کر انھیں کی پناہ میں دیے جاتے تھے۔ اور سب گھر کے ماں باپ ان کے پاس بچّے کو بھیج کر ایسے مطمئن ہو جاتے جیسے بچّہ اپنی ماں کی گود ہی میں ہو۔

وہ بچّوں کے دوست، ہمدرد، رفیق، کھیل کے ساتھی اور ہمراز بھی تھے اور اتالیق، نگراں، سرپرست اور معلّم بھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ بچّے ان سے بے تکلف بھی تھے اور مرعوب بھی۔ جب تک بابا خوش ہیں بچّے ان سے ہنس بول رہے ہیں کھیل رہے ہیں، چھیڑ رہے ہیں۔ لیکن ذرا بابا کے لہجے میں سختی آئی اور ہر ایک دم بخود ہو گیا۔

"بابا خفا نہ ہو جائیں!" یہ خوف بچّوں اور بڑوں دونوں ہی کے دل میں رہتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت کم کسی بچّے کو مارتے اور ڈانٹتے تھے اور جب ایسا ہوتا بھی تو اس میں دل توڑنے والی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ غصّے کی ذرا سی تلخی، طنز کی ترشی، مزاح کی چاشنی اور پیار کا رس اس ڈانٹ کو تلخ سے شیریں بنا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچّے ان کے چشم و ابرو کے اشاروں کو سمجھتے تھے۔

خاندان کا ہر بگڑا بچّہ سنورنے کے لئے ان کی محبّت اور توجّہ کا بھوکا ہوتا تھا، ہمیشہ دو چار بچّے ان کے پاس رہتے۔ کبھی ماؤں کے ساتھ کبھی اکیلے۔ جو بچّہ گھر میں آ جاتا، اب چاہے کوئی کہے یا نہ کہے، اس کی تربیت اور نگہداشت ان کے ذمہ ہو جاتی تھی۔ وہ فوراً پہچان لیتے کہ اس کو کس چیز کی ضرورت

ہے۔ پیار محبت کی تنبیہہ اور سختی کی۔ البتہ بچّوں کی محبت کی شدت میں وہ کبھی کبھی بچّوں کے "بزرگوں" سے بے انصافی کر بیٹھتے تھے اور بچّوں کے مُنہ پر انھیں ڈانٹ دیتے تھے۔ در اصل ان کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہ آتی تھی کہ "بڑے" اس قدر خود غرض کیسے ہو جاتے ہیں کہ اپنے آرام و آسائش یا اپنی بے پروائی سے بچّے جیسی انمول ہستی کی زندگی خراب کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

اگر کبھی اتفاق سے کوئی بچّہ گھر میں نہ ہوتا تو وہ بھولے بھولے گھبرائے گھبرائے اندر سے باہر باہر سے اندر پھرتے رہتے تھے جیسے بے ماں کا بچّہ گھبرایا ہُوا پھر رہا ہو۔ نہ کسی کام میں جی لگتا ہے نہ نماز و تلاوت میں حضور قلب حاصل ہوتا اور نہیں تو پڑوس اور نوکروں کے بچّے ہی اس محبّت کے حصّے دار بن جاتے تھے!

اور بچّوں ہی پر کیا منحصر ہے۔ بچّوں کے ماں باپ بھی ان سے بچّوں کی طرح ہی محبّت کرتے۔ وہ خود جو کبھی خود بچّہ بن کر ان کی محبّت کا مرکز رہ چکے تھے اپنے بچّوں سے رشک کرتے کہ یہ نامراد ہمارے بابا کی محبّت پر قابض ہو گئے ہیں۔ وہ اب ہمیں پوچھتے بھی نہیں اور یہ سُن کر وہ مسکراتے، شکایت کرنے والے کے ہلکی سی ایک چپت لگاتے اور بچّوں پر محبّت کی بارش دُگنی کر دیتے۔

بیس برس پہلے میں نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اجنبی ماحول میں مجھے صرف اُن سے خلوص اور اُنسیت کی بو آئی۔ اس وقت بھی ان کا وہی حلیہ تھا جو آج ہے۔ درمیانہ قد، اکہرا جسم، گورا رنگ، نازک نازک نقشہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں نرمی اور دل سوزی کا گداز۔ ساتھ ہی اصُول پرستی مضبوطی اور دانشمندی کا رنگ جوان کی نرم اور نازک شخصیت میں مردانہ وقار پیدا کرتی تھی! چہرے پر ضدّی پن کی تھوڑی سختی۔ سفید داڑھی اور سر کے گرد سفید ہی بالوں کی جھالر۔ بھووُں پلکوں تک کے سب بال بھی سفید۔ اس وقت جب وہ بالکل جوان تھے۔ کبھی کبھی مجھے شبہہ ہوتا کہ شاید وہ پیدا بھی سفید بال لے کر ہی تو نہ ہوئے تھے؟ اور ان سفید بالوں کے باوجود وہ جوانوں میں کھلنڈرے بچوں میں بچّے بن کر رہتے تھے۔ اور بزرگوں اور بوڑھوں میں اسی وقار اور سنجیدگی سے جو ان کے بالوں کو زیب دیتا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت بالکل بچپانہ تھی۔ چلتے چلتے کسی کا کان اینٹھ دینا، چٹکی لے لینا یا چپت لگا کر معصوم سا مُنہ بنا کر کھڑے ہو جانا جیسے یہ کسی اور کی حرکت ہو۔ بڑوں سے مذاق مگر احترام کے ساتھ نوجوانوں سے ہنسی دل لگی مگر حفظ مراتب کے ساتھ اور بچّوں میں کھیل ان کے برابر کا بن کر ان کی کسی بات میں گھٹیا پن یا بناوٹ محسوس نہ ہوتی تھی اگر وہ اپنے دیہاتی رواج کے مطابق کبھی گالی بھی بک مُٹھتے تو وہ ان کے مُنہ سے اس انداز سے نکلتی کہ اپنا سوقیانہ پن اور گندگی جیسے کھو دیتی

تھی۔ مگر انھیں بڑوں سے کہیں زیادہ دلچسپی اور اُنسیت بچوں سے تھی۔ چاہے وہ اپنا عزیز کا بچہ ہو یا غیر کا امیر کا ہو یا غریب کا۔ بھنگی کا ہو یا چمار کا وہ پاکی ناپاکی چھوت چھات کو بہت مانتے تھے۔ مگر بچوں کی معصومیت پر ان کا ایمان تھا اور ان کو چھوتے اور گود میں لیتے وقت وہ اپنے یہ سب قدامت پرستی کے اصول بھول جاتے تھے۔ ان کا بچوں سے پیار بستی بھر میں مشہور تھا۔ ہر ایک ان کو "بابا" کہتا تھا۔ بچے بڑے نوکر چاکر کسان پرجا۔ کبھی کبھی تو ان کے بزرگ تک انھیں "بابا" کہہ جاتے تھے اور یہ لفظ ان پر ایسا بھپتا جیسے انھیں کے لئے خلق ہُوا ہے۔ بچے تو خیر انھیں چاہتے ہی تھے۔ مگر بچوں کے بزرگ بھی انہیں چاہتے۔ اور ان کی رائے کا پاس کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

یورپ کے تعلیم یافتہ جوان، ترقی پسند لڑکیاں اور انقلابی لڑکے اکثر ان کی قدامت پسندی اور اصول پرستی کے سامنے جھک جاتے وہ خاندانی رسم رواج کی پابندی مذہب کے احترام اور روایات پرستی میں بہت سخت تھے اور جو لوگ ان اصولوں سے متفق نہ ہوتے۔ وہ بھی ان کی شخصیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ دراصل ان کے دل کو دُکھ دینا کسی کو گوارا نہ تھا۔

مجھ پر وہ شروع ہی سے بہت مہربان ہو گئے تھے اور بڑی شفقت

کرتے تھے۔ مجھے بھی پہلی نظر میں ان سے جو خلوص اور اُنسیت پیدا ہوئی وُہ خاندان کی کسی اور ہستی سے نہ ہو سکی - میں سوچا کرتی کہ ان کے دل میں محبّت اور ماممتا کی یہ بے پایاں دولت کہاں سے آگئی جس میں سے ہر ایک بچّہ کو حِصّہ ملتا ہے۔ اور پھر بھی کم نہیں ہوتی؟ جو سرکش سے سرکش کو رام کرلیتی ہے۔ نفسی اور ذہنی بیماری میں مبتلا بچّوں کو تندرست کر سکتی ہے۔ حالانکہ نہ وہ تربیت کے جدید اصولوں سے واقف ہیں اور نہ نفسی اور ذہنی الجھنوں پر جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں اس کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ پھر بھی وہ بچّوں کو سنبھال لیتے ہیں بگڑے بچّے کی اگر کایا پلٹ نہیں تو قلب ماہیت تو ضرور ہی کردیتے ہیں اور اس کی زندگی تباہ اور ناکارہ ہو جانے سے بچ جاتی ہے۔ اور محبّت و خلوص کا یہ نقش اس بچّے کے دل پر ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ نوجوانی کے پرآشوب دور میں جب وہ بچپن کی بہت کچھ باتیں بھلا دیتا ہے، جب ماں باپ کی محبّت اور بےغرضی میں بھی اُسے شبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب وہ اپنے خالق تک سے باغی ہو جاتا ہے اس وقت بھی باباکے پیار اور خلوص کی شمع اس کے دل میں روشن رہتی ہے۔ اور اکثر اسے گمراہی سے بچالیتی ہے۔

ان کی ہنس مکھ اور زندہ دلی شخصیت دیکھ کر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں مسرّت ہی مسرّت، شوخی ہی شوخی، تبسّم ہی تبسّم ہے۔ رنج و فکر

کو ان کے یہاں کم بار ملتا ہے لیکن گہری نظر سے دیکھنے پر اس بشاش چہرے اور ہنستی آنکھوں کے پیچھے غم کا ایک عکس بھی نظر آجاتا تھا۔ وہ گہرا غم جس نے غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنا دیا۔ محبت کی اس نامرادی کا عکس جو آج عالمگیر محبت کی صورت میں جلوہ گر تھی۔

ایک دن میں نے کسی سے پوچھا "بابا" کے بال کیا سدا سے ایسے ہی سفید ہیں؟ اور اس کے جواب میں میں نے جو کچھ سنا اس سے مجھ پر یہ معمہ کھلا کہ ان کے اندر اتنی مٹھاس اتنی محبت کیسے پیدا ہوگئی۔ وہ گھر کے سب سے چھوٹے بچے تھے اور بے حد لاڈلے۔ بزرگوں کی محبت سے وہ گھبرا جاتے اور ان کے دل میں پریم کی جو لہریں اٹھتیں اس کے لئے مرکز تلاش کرتے لیکن مدت تک یہ محبت ان کے دل ہی دل میں پلتی رہی۔ یہاں تک کہ ان کی بڑی بہن فوت ہوگئیں اور ان کی تین چار سال کی بچی ننھیال میں پرورش کے لئے لائی گئی۔ بہن کو وہ بہت چاہتے تھے اور بھانجی کی محرومی اور بے بسی سے بے حد متاثر تھے۔ دوسرے لوگوں نے بچی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن ان کی برسوں کی سنبھال کر رکھی ہوئی محبت اس پر نچھاور ہونے لگی۔ کوئی دایہ اور ماں بھی ایسی خدمت نہ کرے گی جیسی وہ اس بچی کی کرتے تھے۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں جب ان کے ہم عمر نوجوان عشق و محبت کے خواب دیکھنے یا کھیل کھیلتے ہیں وہ اس بے ماں کی بچی کی ماں بنے ہوئے

دنیا کی اور دلچسپیوں سے بیگانہ تھے۔ وہ جنگلی بلّی جو ہر کسی کو دیکھ کر بھڑکتی اور پنجے نکالتی تھی۔ ان کی محبت سے رام ہو گئی اور دن رات ان کے گلے کا ہار رہنے لگی۔ جوان ہوئے شادی، بیاہ، بال بچّے ہو جانے کے بعد بھی یہ "بچّی" ان کی ایسی ہی گرویدہ تھی۔

رواج کے مطابق ان سے اپنی شادی کے بارے میں نہ رائے لی گئی نہ ان کی پسند کا خیال کیا گیا بلکہ خاندانی مصلحتوں کے پیش نظر بزرگوں نے جہاں چاہا بیاہ دیا۔ ان کے دل میں اپنی شریک حیات کا تصور کیا تھا یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا البتہ ان کی خوش ذوقی، نفاست پسندی اور اونچے معیار کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انھوں نے اپنے تخیّل میں اُسے کس حُسن و خوبی کا مالک ٹھہرایا ہوگا۔ لیکن ان کی بیوی سیدھی سادی دیہاتی شریف زادی تھی جس کی زندگی کا مقصد شوہر کی خدمت اور اطاعت کرنا اور بچے پیدا کرنا اور پالنا ہوتا ہے۔ بظاہر ان کا سلوک بیوی سے وہی تھا جو شریف گھرانوں کے نوجوانوں کا ہوا کرتا ہے کہ روز روشن میں بیوی کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھ سکتا اور بالکل بے تعلق اور بیگانہ رہتا۔ صرف نان نفقہ اور تحفہ تحائف دینے کا فرض ان پر عائد ہوتا تھا یا جو بھی فرمائش ساس یا سالیوں کی معرفت بیوی کی اُن تک پہنچی اُسے پورا کرتا۔ کنبہ بڑا تھا۔ بوڑھے جوان، کنوارے، بیاہے سبھی گھر میں رہتے تھے۔ اس لئے تنہائی نصیب ہونا

محال اور بے شرمی کرنا زمانے کے دستور اور ان کی طبیعت دونوں کے خلاف۔ چنانچہ وہ ایک ہوتے ہوئے بھی الگ الگ تھے۔ ان میں وہ یکجائی ہمرنگی، یکجہتی پیدا نہ ہو سکی جو ازدواجی زندگی کی جان ہے۔ نہ وہ قلبی گہری محبت اور قرب جس کی جڑیں ابتدائی زمانہ تاہل کی جذباتی محبت میں پھوٹتی اور آگے چل کر تناور درخت بنتی ہیں۔ برسوں کے بعد انھوں نے اپنا الگ گھر بنایا۔ بڑھاپے کی عمر میں اگرچہ بے تکلفی اور تنہائی کا موقع ملا مگر اب ان میں وہ قرب پیدا نہ ہو سکا۔ وہ شریک زندگی رہے رفیق زندگی نہ بن سکے۔ اور ہندوستان کے بیشتر میاں بیوی ایسی ہی زندگی گزارتے ہیں۔

لیکن بیوی کے حصے کی محبت بھی جب خدا نے بڑی آرزو کے بعد انھیں ایک بچہ عطا کیا تو اس کے حصے میں آگئی۔ بچہ کیا ہوا ان کی زندگی میں بہار آگئی۔ جیسے ساری دنیا کی مسرتیں ان کی جھولی میں ڈال دی گئی ہوں۔ گویا دنیا سے دکھ درد کا خاتمہ ہو گیا۔ ہر طرف بہار ہی بہار پھول ہی پھول، روشنی ہی روشنی، ہنسی ہی ہنسی بکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ بچہ بھی بڑا ذہین بڑا پیارا تھا۔ اپنی من موہنی حرکتوں اور میٹھی مسکراہٹ سے راہ چلتوں کو موہ لیتا۔ باپ تو پھر باپ تھے۔ ان کا ایسا عاشق زار کہ دور سے دیکھا نہیں اور ہمکنار کرنا شروع کر دیا۔ اس معاملہ میں انھوں نے رواجی شرم کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ بچے کو دن رات لیے رہتے۔ چھ مہینے کی عمر میں جو

پہلا لفظ بچے نے سیکھا وہ "بابا" تھا "بابا" اُسے ہر وقت اسی لفظ کی رٹ لگی رہتی ہے۔ کتنی مٹھاس کتنا رس تھا اس کے مُنہ سے نکلے ہوئے اس ٹوٹے پھوٹے لفظ میں۔ وہ باپ کے پاؤں کی چاپ پہچانتا تھا۔ نظروں پر کھتا تھا۔ نہاتا تو ان کے ہاتھ سے کھانا کھاتا تو ان کے ہاتھ سے۔ سوتا تو ان کے پاس۔ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور یہ اپنی ڈولتی ٹانگوں سے رکوع و سجدے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر صرف سجدہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ باہر دوستوں میں باتیں کر رہے ہیں اور یہ زانو پہ تتلا تتلا کر باتیں کرتے جاتے ہیں۔ اور سب ان کی حرکتوں پہ ہنس رہے ہیں۔ باپ کے دفتر سے آنے کا وقت ہوتا تو گرتا پڑتا ڈیوڑھی کے باہر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ صبح کو کام پہ جاتے تو یہ گلی کے نکڑ تک چھوڑنے آتا اور روتا چلاتا گھر واپس جاتا۔ ماں بچے کا کام کرنے کو ترستی وہ کڑھتی کہ بچے کو مجھ سے زیادہ باپ سے پیار ہے۔ مگر بچے کو جو چین "بابا" کے پاس ملتا وہ کسی سے نہ ملتا تھا۔

بیٹا اور ایسا بیٹا! ہر باپ اُسے چاہتا اور پھر "بابا"۔ اُسی دن سے تو وہ "بابا" مشہور ہوئے تھے۔ تو اس کے سچ مچ عاشق زار تھے۔ جہاں جہاں وہ پھرتا ان کی نظریں ساتھ ساتھ پھرتیں۔ وہ ان کا ننھا سا دوست، چھوٹا سا رفیق، ان کی تمناؤں کا مرکز، آنکھوں کی روشنی، دل کی ٹھنڈک، آشناؤں کا سہارا تھا۔ انھوں نے اپنے تصور میں مستقبل کے بڑے اونچے اونچے محل تعمیر

گئے تھے۔ جن کا مرکز یہ ننھی سی ہستی تھی۔ انھوں نے اس کی اور اپنی مشترکہ زندگی کا ایک بڑا ہی حسین، بڑا ہی دل کش نقشہ بنایا تھا اور اس میں مثالی رنگ بھرے تھے۔ یہاں تک کہ ماں کی ممتا کو ان سے رشک پیدا ہو گیا تھا "یہی تو بچے کے سب کچھ ہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں مر بھی جاؤں تو یہ خوب مزے سے اپنے بیٹے کو پال لیں گے" وہ ناز اور رقابت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اپنی سہیلیوں سے کہتی اس کی تمناؤں کا مرکز بھی تو وہی تھا نا آخر!

اڑ اڑ ر ڑ ادھم۔ ایک دھماکا۔ خوفناک تڑاخا۔ اور سارا محل زمین پر ڈھے کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ "آہ انسانی ذہن کی تعمیریں۔ شیشے سے بھی کہیں زیادہ نازک جو حوادث کی ایک ننھی سی کنکری سے پاش پاش ہو جاتی ہیں"۔ چار سال تک ان تھک محنت سے بنایا ہوا محبت اور آشا کا قلعہ پل بھر میں مسمار ہو گیا "بابا" کا بیٹا" اپنے بابا کو چھوڑ کر کسی اور دنیا میں چلا گیا۔ شاید وہ دُنیا زیادہ حسین، زیادہ پاکیزہ تھی۔ شاید وہاں کا "بابا" اس "بابا" سے بھی زیادہ شفیق زیادہ محبت والا تھا۔ شاید اس پیارے بچے کی اُسے بھی ایسی ہی چاہت تھی۔

وہ آخر دم تک بابا کی گود میں رہا۔ جب موت دھیرے دھیرے اس پر اپنا سایہ ڈال رہی تھی، تب بھی وہ اسی انداز سے مسکرا رہا تھا۔ وہ ہی مدھری دل کش مسکراہٹ! اس کی نیم وا آنکھیں باپ کے چہرے پر تھیں۔

ان کی اُنگلی اس کے ہاتھ میں تھی! اور وہ پتھّر کی بے حس مورتی کی طرح اس دل کش مسکراہٹ کے سحر میں کھوئے ہوئے بیٹھے رہے۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب ان کی اُنگلی ننھّی گرفت سے چھوٹ گئی۔ کب چہرے پہ جمی پیار بھری نظریں پتھرا گئیں۔ کب پھول کی پتیوں پہ بکھری مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے جم گئیں۔ کب گلاب کی پنکھڑیاں اپنی شادابی اور رنگ کھو کر نیلی پڑ گئیں! بلکنی ماں کی فلک شگاف چیخیں دادی، پھوپی، نانی کے بین کوئی بھی انھیں ہشیار نہ کرسکے کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ ان کی گود سے ان کی متاع کو لے لے۔ کس کا ایسا پتھّر کا دل تھا جو عاشق باپ سے ہمیشہ کے لئے اس کے ارمانوں کی دنیا کو چھین سکتا؟

مگر آخر کہاں تک؟ ان کے بڑے بھائی نے اپنا دل پتھّر کا کیا اور آکر دھیرے سے بھائی کی گود سے بھتیجے کو لے لیا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں "بھیّا۔ صبر۔ صبر جس کی چیز تھی۔ اس نے لے لی۔" بھائی نے روتے ہوئے کہا انھوں نے حیران حیران نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ ایک نظر بچّے کے جسد بے جان پہ ڈالی۔ دو بار بیٹھے بیٹھے جھومے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

- - - - - - - - - - - - - -

اس جانکاہ واقعہ پہ نہ انھوں نے نالہ و شیون کیا، نہ خدا قسمت اور ڈاکٹر کی شکایت چپ چاپ جانماز پہ بیٹھے دعا اور تسبیح پڑھتے رہتے تھے،

نگران کے جسم کی طاقت، دل کی مسرت، روح کا سکون، آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی شوخ مسکراہٹ اور معصوم ہنسی، چہرے کی شادابی غائب ہو گئی تھی! ایک بھیانک تنہائی۔ سیاہ اندھیرا ہر طرف چھایا محسوس ہوتا تھا! یہاں تک کہ ان کے دل سے جیسے محبت کرنے کی انمول صلاحیت بھی سلب ہو چکی تھی! مہینہ بھر سے زیادہ ہو چکا تھا نہ انھوں نے کسی بچّے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا نہ کسی اور سے بات کی۔ نہ مسکرائے نہ روئے۔

بیوی کی کوکھ اجڑ چکی تھی اور اب اُسے اپنے سہاگ کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ دُکھیا شرم و لحاظ چھوڑ کر ان کے پاس آتی ان کا ہاتھ پکڑ کر بچّے کا ذکر کرتی! تسلّی دینے کی کوشش کرتی۔ مگر سب بے سود۔ تسلّی اُسے دی جاتی ہے جو بے قرار ہو۔ صبر کی تلقین اُسے ہو سکتی ہے جو بے صبر ہو، ذکر اس سے کیا جا سکتا ہے جو اس کو سُنے۔ مگر وہاں تو ایک مکمل خاموشی تھی بے پایاں مایوسی تھی! اور کچھ نہ تھا!

اور یہ آشا تو اب کسی کو بھی نہ تھی کہ وہ پہلی سی زندگی یعنی، زندہ دلی اور ظرافت ان میں پھر نظر آئے گی۔ وہ زندہ بچ جائیں یہی بہت کچھ تھا! بچّے کے ساتھ لوگ ان کی دل کش شخصیت کو بھی رو بیٹھے تھے! لیکن یہ معجزہ بھی ہو کر رہا۔

ان کی محبوب بھانجی جو بیماری کی وجہ سے بچّے کی موت پر نہ آسکی تھی

سسرال سے میکے پہنچی تو اس کا دل کانپ رہا تھا! وہ کیسے ان کا غمگین چہرہ دیکھے گی؟ کس دل سے ان کا درد بھرا افسانہ سُنے گی۔

لیکن یہ کیا؟ یہ کون ہیں؟ سر داڑھی، مونچھ اور بھوؤں تک کے بال سفید۔ ہائے یہ اس کے پیارے ماموں جان ہیں؟ ایک بھینے ہیں۔ اُن کا سیاہ سر سفید جھک ہوگیا؟ وہ جذبات سے لرزتی ہوئی آگے بڑھی اور اُن کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انھوں نے ایک ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور بس۔

پھر جانے کیسے اس کے دماغ میں روشنی کی ایک لہر دوڑی۔ وہ جھپٹ کر اٹھی، دوڑی گئی اور اپنی چھوٹی سی بچی کو لاکر ان کی گود میں ڈال دیا۔ کچھ دیر بچی حیرت سے اس اجنبی غم زدہ چہرے کو تکتی اور خالی خالی بے رنگ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہی جو بے معنی نظروں سے اُسے تک رہی تھیں۔ گود بھری تھی مگر دل سنسان تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔

یکایک بچی مسکرائی۔ اس کے ہونٹوں کے کونے پھڑ پھڑائے اور اس نے تُتلا کر کہا "بابا" وہی آواز وہی مسکراہٹ — وہ ایک لمحے تک حیرت زدہ اُسے دیکھتے رہے اور پھر زور سے چھاتی سے لپٹا لیا۔ سنسان دل آباد ہو گیا۔ ویران آنکھیں سیراب ہوگئیں — مایوسی کا بھیانک اندھیرا چھٹ گیا۔ امید اور عقیدے کی روشنی جلوہ گر ہوگئی۔ وہ اُسے گلے لگائے روتے رہے۔

روتے رہے اور ان کے دل اور جسم ان مقدس آنسوؤں میں نہا کر شفا پاتے گئے۔

یہ ننھّی بچّی رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی اور چند مہینے میں "بابا" پھر وہی "بابا" ہو گئے۔ چونچال۔ ظریف خوش مزاج، ہنس مکھ، محبت سے بھرپور بابا۔ اب وہ سب کے بابا تھے۔ ہر بچے کے بابا۔ مگر محبت کا مرکز وہی ننھی بچّی تھی جس نے ان کے خالی دل کو آباد کیا تھا۔

"تو بہن اسی طرح نوجوانی ہی میں بابا بچارے کے سارے بال سفید ہو گئے تھے" مجھے یہ واقعہ سنانے والی نے بتایا۔ مگر وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ اس حادثے نے ان کے بال ہی سفید نہیں کئے دل بھی روشن کر دیا تھا۔ اب مجھ پہ کھلا کہ ان میں اتنا رس، اتنی مٹھاس، ایسا پریم کہاں سے آ گیا تھا؟ کیوں بچے ان پہ پروانوں کی طرح گرتے تھے؟ کیوں وہ ہر بچے کو اپنا ہی بچہ سمجھتے تھے!

اُس ننھے معصوم فرشتے کی محبت نے اب دوسرا روپ دھار لیا تھا۔ وہ محبت جو صرف ایک ذات کے گرد گھومتی ـــــ یا صرف بچوں تک محدود رہتی۔ اب حدیں توڑ چکی تھی۔ اس میں اب سمندر کی سی وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ قدرت نے ایک بچہ ان سے چھین لیا مگر کتنے بہت سے بچوں کا پیار ان کو بخش دیا۔ وہ اپنی قسمت کے شاکی نہیں شاکر نظر آتے تھے۔ ان کا بچہ

زندہ رہتا تو وہ شاید دوسرے بچوں کا زیادہ خیال نہ کرتے ـــ مگر اب ہر ضرورت مند بچہ ان سے فیض حاصل کر سکتا۔ کتنے تعلیم و تربیت سے محروم، محبت اور پیار کے پیاسے بچے ان کی بدولت اس نعمت کو حاصل کر سکے تھے! کیا یہ شکر کا مقام نہ تھا کہ خدا نے انھیں یہ اونچا درجہ یہ مقدس فریضہ عطا کیا تھا؟

میں ان خیالات میں کھوئی بیٹھی تھی کہ پیچھے سے میرے سر پہ ایک چپت پڑی میں نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ بابا کھڑے مسکرا رہے تھے "ارے میں سمجھا بانو ہے" ان کی شریر آنکھیں مسکرا رہی تھیں "کیا ہوا۔ میں کیا آپ کی بچی نہیں ہوں؟" میں نے ان پہ گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ شاید میری آواز کانپ رہی تھی یا میری آنکھیں میرے دل کے حال کی غمازی کر رہی تھیں وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے، دبے ہوئے غم اور محرومی کا ایک سایہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں تیرتا ہوا مجھے محسوس ہوا۔ جس میں امٹ یادیں تھیں۔ تنہائی کا درد بھرا احساس تھا اور کسی کا محبوب تصور ـــ

مگر جلد ہی انھوں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا مسکرائے۔ وہی بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ پاس کھڑے ایک چھوٹے بچے کو، جو اتنی دیر سے مجھے غصے اور رشک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا "میرا بیٹا۔ بڑا پیارا میرا بیٹا؟" ـــ بے اختیار آنسو میری آنکھوں سے نکلے اور گالوں پہ ڈھلک گئے۔

خوشی کی چند گھڑیاں

عمر کے بہتر۔بن سال بیتے بعد۔ دیگرے حسرت ہی ہیں نکلے چلے جا رہے تھے! تیس ۳۰ برس کی عمر ہونے آئی اور زندگی کی سب سے بڑی تمنا اب بھی اتنی ہی دور تھی جتنا چکور سے چاند۔ ابھی وہ دس گیارہ ہی برس کا ہوگا جب اس آرزو کا بیج ماں کی محبّت بھرے جملوں نے اس کے دل میں بونا شروع کر دیا تھا۔ چاند سی بہو" لانے کی وُہ ہزاروں سال پرانی کامنا جو ہر ماں کے دل میں بچّے کا مُنہ دیکھتے ہی ممتا کے جوش کے ساتھ سینے کی گہرائیوں میں جانے کہاں سے ابل آتی ہیں۔ اسے یاد بھی نہ تھا کہ کتنے برسوں سے وہ یہ سب سُنتا آ رہا ہے۔ پہلے پہل وہ بہو اور بیاہ" کا نام سُن کر شرما کر باہر بھاگ جایا کرتا تھا! اس نے اپنے ہمجولیوں سے سُنا تھا کہ بیاہ اور بہو بڑی شرم کی چیزیں ہیں پھر ہوتے ہوتے جب جوانی کی امنگیں دل میں ابھرنے لگیں اور بیاہ اور بہو کا ایک دھندلا سا، خوشگوار سا، دلکش سا تصوّر، اس کے ذہن میں تشکیل

پا گیا تو ماں کی تمنا کو سُن کر وہ سر جھکا لیتا، منہ لال ہو جاتا کان جلنے لگتے، اور سینے کے اندر کوئی ننھا سا پرندہ پھڑپھڑا اُٹھتا۔ برسوں تک یہ حال رہنے کے بعد اب وہ اس قسم کی باتیں سُنتا تو بجائے شرم یا آرزو کے اُسے جھنجلاہٹ آجاتی۔ غصّے میں بُڑبڑانے لگتا۔ اور پھر جب ماں کو اس آرزو کی ناکامی کے صدمے میں روتا دیکھتا تو وہ ہنس ہنس کر اس کو بہلاتا اور سمجھاتا کہ ماں کیوں گھبراتی ہے۔ چاند سی بہو ایک دن تیرے پہلو میں ضرور بیٹھے گی آکر۔ لیکن اس کی دل کی گہرائیوں میں تو بس اب ایک نامعلوم سی حسرت ناکام سی تمنّا ان جانی سی کسک ہی باقی تھی! "چاند سی بہو" کا تصوّر بھی اس سے روٹھ گیا تھا۔ اس کے دوست ہمجولی، ساتھی سب بیاہے جا چکے تھے۔ ان کی نو عمر نئی نویلی دلہنیں اپنی جوانی کی چہل پہل، سنورنا اور اِٹھلانے کی بھینٹ دے کر اب ممتا کے اُونچے سنگھاسن پر براجمان تھیں۔ کوئی چار بچّوں کی ماں تھی کوئی چھ کی اور کسی کا نمبر اس سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ یار دوستوں کو گھرداری کی چکّی میں پستا دیکھ کر، غربت اور نحوست کے عذاب میں مبتلا پا کر، بیماریوں اور پریشانیوں کے بھنور میں چکّر کھاتا دیکھ کر وہ لاکھ دل کو سمجھاتا "دیکھو ہم تو بڑے مزے میں ہیں۔ اپنی نیند سوتے ہیں اپنی مرضی سے جاگتے ہیں اچھا کھاتے ہیں اچھا پہنتے ہیں۔ بک بک جھک جھک نہیں۔ بچّوں کی ریں ریں نہیں ہیں۔ نہیں روز روز کی پیدائش کی مصیبت کا جھگڑا

نہیں ۔عیش کرتے ہیں عیش "۔ پر دل ایسے فریب کھانے والا نہ تھا۔سارے دکھوں اور پریشانیوں کے باوجود دوستوں کے چہرے پر اپنی گھروالی کو دیکھ کر فخر و شان کا جو رنگ پیدا ہو جاتا، ان کی چھاتی جس طرح تن جاتی، ہونٹوں کے کونے جس انداز سے پھڑ پھڑاتے، آنکھوں میں جو چمک پیدا ہو جاتی، وُہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی تھی ۔بچوں کو گود میں لے کر یا کندھے پر چڑھا کر ان کے چہرے پر مسرّت کی جو برکھا ہوتی تھی، اور جس برتری اور شان کا غیرارادی طور پر ہی سہی وہ مظاہرہ کرتے تھے وہ اس کے دل کو تڑپانے کے لئے کافی تھا اور وہ بے قرار ہو جاتا اس پھل کو چکھنے کے لئے جو قسمت نے اس کے لئے جانے کیوں ممنوع کر دیا تھا۔

آخر وہ کیوں اس نعمت سے محروم ہے جو دوسری کو اس آسانی کے ساتھ فراہم ہو جاتی ہے ۔کیا صرف اس لئے کہ قدرت نے اس کو صرف ایک آنکھ بخشی تھی ۔ یہ قدرت کی کیسی ناانصافی ہے ۔کہ ایک تو اس کو دو کے بدلے ایک ہی آنکھ نصیب ہوئی اور پھر اس کی وجہ سے وہ زندگی کی سب سے بڑی مسرّت سے بھی محروم ہو گیا۔

اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ آخر انسان کو دو آنکھوں کی ضرورت ہی کیا ہے ۔سبھی کے اس کی طرح ایک آنکھ کیوں نہیں ہے ۔ کیا ایک آنکھ سے آدمی وہ سب کچھ نہیں دیکھتا جو دو سے دیکھتا ہے ۔۔ اور اگر سب کو

دو آنکھیں بلنی ایسی ہی ضروری تھیں تو اس کو کبھی ایک اور مل جاتی تو آخر ایسی کون سی کمی آجاتی، قدرت کے کارخانے ہیں۔ اور پھر شادی کے لئے۔ ایک آنکھ ہو یا دو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لولا لنگڑا نہیں کہ محنت مزدوری کر کے بیوی کا پیٹ نہ پال سکے گا۔ اپاہج نہیں کہ بے کار ہو۔ بہرا نہیں کہ بیوی کی باتیں نہ سُن سکے گی۔۔ اندھا نہیں کہ اس کے حسن و ناز و ادا کو نہ دیکھ سکے گا؟ پھر آخر کیا مصیبت ہے کہ اُسے بیوی نہیں مل سکتی؟

وُہ صورت کا بُرا نہ تھا! اچھا گٹھا ہُوا ورزشی جسم۔ کھلتا ہُوا سانولا رنگ۔ لمبی سی ناک، گھونگریا لے بال۔ گہرے رنگ کے شیشوں کا چشمہ لگا کر اور بالوں میں تیل چپڑ اور لہریں ڈال کر جس وقت وہ باہر نکلتا تو بقول اس کی ماں کے "چشم بد دور میرا بیٹا جنٹل مین لگے ہے"۔ پھر کماؤ پوت کے تو دس عیب ڈھک جاتے ہیں۔ اس میں تو صرف ایک ہی عیب ہے اور اُسے بھی گہرے رنگ کے شیشے بالکل ڈھک لیتے ہیں۔

مگر برا ہو اس منحوس رواج کا کہ جہاں کسی میں لوگوں نے کوئی جسمانی نقص دیکھا اور اُسے اس سے منسوب کر کے پکارنا شروع کر دیا۔ بہرے کو "بہرا" لنگڑے کو "لنگڑدین" ٹنڈے کو "لولا" اندھے کو "اندھا" اور کانے کو "کانا" کہتے ہیں۔ کون سی ظرافت کون سی خوش ذوقی، کون سی محبت کا اظہار ہے؟ اُس کا نام کانو کس نے رکھا، کب رکھا، اُسے ذرا بھی یاد نہ تھا۔ لیکن یہ وہ جانتا تھا

کہ اس کی محرومی کا اصل سبب یہ منحوس نام ہی ہے ۔ بچپن میں ساتھی جب اُسے اس نام سے پکارتے تو وہ بے سمجھے بوجھے بھی رونے لگتا تھا ۔ جوانی میں دوست احباب جب مضحکہ خیز انداز میں یہ نام لیتے تو بظاہر وہ ہنس کر ٹال دیتا مگر دل کے اندر ایک کسک پیدا ہوجاتی ۔ اماں نے لاکھ چاہا کہ لوگ یہ منحوس نام لینا چھوڑ دیں ۔ اچھا خاصا چھوٹے خاں نام تھا اور اماں اور ابا دونوں نے ہمیشہ اسی نام سے پکارا ـــ مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ ان کے سوا اور ہر کسی کو کانو ہی سے پیار تھا ۔ لوگوں کو کانو کہتے میں جو مزا آتا تھا وہ چھوٹے خاں میں کہاں ؟ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے پہلے اس کا نام ہر جگہ پہنچ جاتا تھا اور سب کو اس کے جسمانی نقص سے آگاہی ہو جاتی ۔ وہ سوچتا لوگ چوری کرتے ہیں ، بے ایمانی کرتے ہیں ، رشوت لیتے ہیں ، ظلم و زیادتی کرتے ہیں ، دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں ، بدمعاشیاں کرتے ہیں ، شرابیں پیتے ہیں ـــ اگر جسمانی نقص کی جگہ لوگوں کو ان کے ذہنی روگوں سے منسوب کر کے پکارا جائے تو کیسا رہے ؟ یہ اس سے تو کہیں اچھا ہوگا ۔ قدرت ہمیں اندھا ، کانا ، چپٹا ، لنگڑا لولا کر دیتی ہے تو اس میں نہ ہمارا بس ہے نہ کوئی دوش ۔ لیکن لوگوں کو ان کی ان صفات سے پکارا جائے تو شاید وہ اپنی اصلاح ہی کر لیں ـــ اگر وہ بھی کسی کو "راشی" کسی کو "بے ایمان" کسی کو "ظالم" کسی کو "اوباش" کسی کو "جھوٹا" کہہ کر پکارنے لگے ـــ تو ۔ ؟ تو یہی لوگ تلملا نہ اٹھیں گے ؟ اس وقت ان کی

ظرافت اور تمسخر کہاں چلا جائے گا؟

مگر یہ ساری فلسفیانہ باتیں جلے دل کے پھپولے تھے۔ جہاں کہیں ہاں اس کی "بات" لے کر جاتی ذرا سی پوچھ گچھ کے بعد پیام رد کر دیا جاتا۔ کوئی صاف صاف کہہ دیتا "نہ بوا۔ کون کانے کو بیٹی دے کر ناکو بنے۔" کوئی حیلے بہانے سے انکار کر دیتے۔ اور ماں گھر آکر ان بیٹیوں والوں کے غرور پر انھیں ہزاروں باتیں سناتی۔ اس کے سپوت میں سینکڑوں خوبیاں ہیں۔ نیک چلن ہے۔ کماؤ ہے۔ سیدھے سبھاؤ کا ہے خوش مزاج ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ دوسروں کے آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا۔ میں تو خود نہ کرتی وہ لڑکی کالی بھجنگ ہے۔ یہ چیچک رو ہے اس کا مزاج خراب ہے اس کے ڈھنگ برے ہیں۔ ماں لاکھ باتیں بناتی مگر یہ سب کے گھاؤ پر مرہم رکھنے کی جگہ نمک چھڑکتی تھیں۔ وہ کانا نہ ہوتا تو یہ ذلت کاہے کو سہنی پڑتی۔

- - - - - - - - - - - -

اور اب چھپتر پھاڑ کر یہ دولت مل رہی ہے۔ تو کیسے وہ بھلا اسے چھوڑ دے یہ تو قدرت اس کے صبر کا پھل دے رہی ہے۔ کرنے دو لوگوں کو مخالفت بنانے دو باتیں جل رہے ہیں سب کے سب اور کیا۔ بھلا ایسی عورت جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے نکاح کرنے کو تیار ہے، اس کی خاطر اچھے

اچھوں کو ٹھکرا رہی ہے، اُسے ـ صرف اُسے اپنانا چاہتی ہے؛ بھلا اور کہاں ملے گی اُسے ایسی عورت؟ مگر ماں کو کیسے راضی کرے؟ بستی والوں نے خواہ مخواہ اُسے بھڑکا دیا ہے۔ نہیں تو ماں ایسی نہیں۔ نہ سہی وہ کنواری۔ جوان تو ہے سندر تو ہے۔ ہر کسی سے کیسی ہنسی ہنس کر باتیں کرتی ہے جیسے مُنہ سے پھُول جھڑ رہے ہوں، ماں کیا جانے کہ جمیا کے ہونٹوں کی میٹھی مسکان، پتلی کمر، آنکھوں کی چمک اور گدرایا ہُوا جسم دیکھ کر اس کے بیٹے کے دل کے تار کیسے جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ یا یہ پھر کوئی نہیں؟ یہ پہلا۔ اور آخری ـــ موقع اُسے ملا ہے، اگر یہ ہاتھ سے نکل گئی تو چھوٹے خاں تم زندگی بھر گھر اور گھر والی کی حسرت میں تڑپو گے ـــ کیا محبّت کے اتھاہ ساگر کی ایک بوند بھی اس کے حصّے کی نہیں ہے؟ کیا پریم کی چاہ اس کے دل میں بھی اتنی ہی نہیں جتنی کسی اور کے دل میں؟ اس ملتی مایا کو بھلا وہ کیسے چھوڑ دے۔ آئی لکشمی کو ٹھکرا دینا غرور ہے۔ نہیں وہ یہ گناہ نہیں کرے گا! ہرگز نہیں کرے گا۔

آٹھ دس دن ہوئے جب پہلی بار جمیا اس بستی میں آئی تھی اور اس دن سے چھوٹے خاں کے دل کی دنیا بدل گئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ایک ہاتھ میں چھپے پلنگ پوش میں بندھی گٹھری لٹکائے اور ہاتھ گلے میں دو چار چاندی کے زیور پہنے۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالے ـــ ہونٹوں پر مٹی سی لالی کا نشان لئے۔ جمیا آکر کھڑی ہو گئی تو لوگوں کو اچھا خاصا تماشہ ہاتھ آ گیا۔

چھوٹی بستیوں میں بات جلد۔ی پھیل جاتی ہے جیسے دیکھو پکا چلا آرہا ہے۔ عورت۔ مرد اور بچّوں کا اچھا خاصا جمگھٹا لگ گیا۔ کون ہے یہ؟ کہاں سے آئی ہے؟ جوان عورت ہے۔ چرِ بانک معلوم ہوتی ہے۔ غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ مگر جمیا نے جلد ہی سب کی زبان بند کر دی "آدمی ہوں اور کون ہوں۔ بہت دُور سے آئی ہوں۔ تمہیں کیا فکر ہے۔ اپنا کھاؤں گی — اپنے آپ کماؤں گی — ہاں ہاں لے جاؤ اپنی بیٹیوں کو کولھوں سے لگا کر بٹھالو۔ میں انھیں پر چانے نہیں آئی"۔ اس نے اس طرح چمک چمک کر سب کو جواب دیئے کہ لوگوں کی پھر اس کے منہ پر کچھ کہنے کی ہمّت نہ پڑی۔ اور اس جرأت ہی نے سب سے زیادہ چھوٹے خاں کا دل لبھایا۔ وہ تو آج تک یہ بھی نہ کہہ سکا کہ تم لوگ مجھے کانا کیوں کہتے ہو۔ اور یہ عورت ہو کر کیسی بہادر ہے کسی سے نہیں ڈرتی۔

اور ایک دو دن ہی میں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ جمیا کمانے نہیں آئی کسی کمانے والے کی تلاش میں آئی ہے۔ کہ کوئی شریف مل جائے تو گھر بسا کر رہے۔ اب تو لوگوں میں اور بھی کھچڑی پکنے لگی کہ آخر یہ ہے کس قسم کی عورت! اس نے تو یہی بتایا تھا کہ اس کا گھر والا مر گیا ہے وہ بیوہ ہے اور اب پھر اپنا گھر بسانا چاہتی ہے۔ مگر پرکھنے والے پرکھ گئے کہ یہ کسی دُکھیا بیوہ کا انداز نہیں لیکن چھوٹے خاں کو تو اس کی ہر بات پہ ایمان تھا! ہر ادا اچھی لگتی تھی! اس

کے دل سے برابر یہی آواز آ رہی تھی! کہ یہ عورت خدا نے خاص الخاص اس کے لئے بھیجی ہے۔

جمیا جلدی ہی بیاہ کرنا چاہتی تھی اور اس سے زیادہ جلدی تھی خود چھوٹے خاں کو! خاص کر اس لئے کہ لوگ کہیں جمیا کو بہکا سکھا کر اس سے نفرت نہ کر دیں! اتنے دن ہی میں بستی میں اس کے بہت سے چاہنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ اور ہوتے کیوں نا؟ وہ جوان تھی، سندر تھی اور پھر سونے چاندی کے زیور پہنے تھی۔ بھلا ایسی سونے کی چڑیا کون نہ چاہتا۔ مگر چھوٹے خاں کو اس کے زیور اور روپیہ کا ذرا سا بھی لالچ نہ تھا۔ وہ تو دل میں دعا مانگتا کہ جمیا کا زیور چوری ہو جائے، تو کیا اچھا ہو۔ مگر لوگوں نے ہزار سر مارا پر جیت اس کی ہوئی۔ جمیا نے اور سب کو ٹھکرا دیا اور اس نے اپنانے کا فیصلہ کر دیا۔ لوگوں کے مرچیں لگ گئیں۔ ہزاروں باتیں بنائیں اس کی ماں کو بھڑکایا، مگر چھوٹے خاں اپنے ارادے میں اٹل تھا۔

آخر ماں کو بیٹے کی حالت دیکھ کر ہار ماننے ہی بن پڑی۔ جانتی تھی کہ برسوں سے وہ بیاہ کی آرزو میں تڑپ رہا ہے اور لوگ کانا ہونے کے باعث اُسے بیٹی نہیں دیتے۔ آخر جوان مرد کہاں تک یوں بیٹھا رہے گا۔ میں بیاہ کرنے کی اجازت نہ دوں گی تو وہ کوئی دوسرا راستہ نکالے گا! پھر عورت کا کیا ہے جس طرح میاں رکھے گا۔ رہے گی!

اور آخر چڑھاوے کا جوڑا، نتھ، ہنسلی اور گھونگھروالے چھلے اور پازیب ماں کو خریدتے ہی بنی بری کا جوڑا اور برات سجا کر سہرا باندھ کر جس وقت وہ جمیا کی کوٹھری کے سامنے پہنچا تو اس کا سر جیسے ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کا دل بے پروں کے اڑا جا رہا تھا اور اس کی آنکھ میں اندرونی جوش اور مسرت سے پریاں ناچ رہی تھیں اگرچہ اس کو کالے شیشے کی عینک نے کسی کو دیکھنے نہیں دیا۔

- - - - - - - - - - - - -

اور پھر زندگی کے وہ پندرہ مسرت بھرے دن۔ کیا وہ کبھی بھلا سکے گا ان دنوں کو؟ جن میں رنگ ہی رنگ، جھنکار ہی جھنکار، کیف ہی کیف، نشہ ہی نشہ بھرا ہوا تھا۔ پھولوں کی مہک، غنچوں کی چٹک، کھیتوں کی لہلہاٹ۔ درختوں کی ہریالی پرندوں کی چہچہاٹ، چاندنی کا نکھار دھوپ کا سنہری پن ہوا کی نرمی، فضا کی رنگینی ــ ہر چیز میں ایک نیا روپ تھا۔ نیا نکھار تھا۔ نیا حسن تھا۔ جب اس کے دل کا ہر تار جمیا کے قرب سے جھنجھنا اٹھتا۔ جب رواں رواں اس کی مسکراہٹ پر ناچنے لگتا تھا۔ جب امنگ اور حوصلہ کا ایک انوکھا احساس اس کے انگ انگ میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ کچھ کرنے، کچھ بننے کا شوق پہلے پہل دل میں جاگ اٹھا تھا۔ جس پر اس کی جمیا فخر کر سکے جس کی بدولت وہ آرام اور عزت سے رہ سکے۔ ناز کرے کہ کیسے جوان سے

اس نے بیاہ کیا تھا۔ اب اُسے یہ یاد بھی نہ آتا کہ اس میں کوئی عیب ہے۔ جمیا کو اس کی پروا نہیں تو اُسے ہی کیوں ہو؟ جمیا نے اُسے محبت کی ایک ایسی دولت بخشی تھی جس سے وہ تیس بتیس برس کی عمر تک بے خبر تھا۔ محبت کی وُہ گرمی جو نہ تو ماں کے پیار میں اُسے ملی تھی نہ بہنوں کی چاہ میں، نہ یار دوستوں کی اُلفت میں اور نہ پالتو جانوروں کے بے زبان پریم میں۔

اس کا خالی دل آباد ہو گیا تھا۔ پیاسی روح سیراب تھی؛ بھوکی آنکھیں سیر تھیں۔ مسرت، محبت اور خود اعتمادی اور سکون کا احساس اس کی رگ رگ میں بس گیا تھا۔

اور پھر پندرہ دن تک جنت کی جھلک دکھا کر جمیا چلی گئی۔ ایک تابناک ستارہ اچانک اس کے قسمت کے آسمان پر طلوع ہُوا، اپنی چمک دمک دکھائی اور پھر...یونہی ایک دم غروب ہو گیا۔

وہ پشپا تھی اور ایک پر سکون گھریلو زندگی کی تلاش میں — اپنا کوٹھا، اس کی چمک دمک عیش و عشرت، اس کا ہنگامہ — سب کچھ چھوڑ کر وہ اس بستی میں آئی تھی! اور اس سادہ دل محبت سے بھرپور، پر خلوص نوجوان کی پریم کی گرمی سے جیسے وہ مسحور سی ہو گئی، سب کچھ بھول کر اس کی آغوشِ محبت کو آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چھوٹے خاں یہ سب جانتا تھا — جمیا نے شادی کے بعد ساری باتیں اُسے بتا دی تھیں۔ پھر بھی اس کے

دل میں اس کی طرف سے کوئی نفرت یا بدگمانی پیدا نہیں ہوئی ۔ گناہ انسان ہی سے ہوتا ہے ۔ اور پھر جو اپنے گناہ سے توبہ کرلے ، اس سے زیادہ پاک بھلا اور کون ہو سکتا ہے ۔ اُسے جمیا کی محبت ، وفا اور شرافت پر پورا یقین تھا۔ لیکن ــــ یہ کیا ہوا ؟ وہ کیوں چلی گئی ؟ اس کا جواب کبھی بھی اُسے نہ مل سکا۔

اور اب جس طرف چھوٹے خاں نکل جاتا اُسے تمسخر اور طنز و طعن کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ جو لوگ جمیا کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اب خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے ۔ اور جو لوگ پہلے ہی سے اس رشتہ کے خلاف تھے وُہ اپنی دانشمندی اور اس کی حماقت کا تذکرہ کرتے نہ تھکتے تھے ۔ لیکن ہزاروں طعنوں تشنوں آوازوں توازوں اور ہدف ملامت بننے کے بعد بھی چھوٹے خاں نہ بیزار تھا اور نہ دل شکستہ جمیا اُسے چھوڑ کر چلی گئی ۔ لیکن کیا وہ ان پندرہ پر مسرت دنوں کی یاد کو کبھی بھلا سکے گا ۔ جب وہ جمیا کی آغوش میں سر رکھ کر اپنے کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھا کرتا تھا ؟ جب جمیا اس کے گھونگھریالے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلایا کرتی تو اُسے کیا آنند کیا سکون محسوس ہوتا تھا ! ہاں جمیا اس کو چھوڑ کر چلی گئی ۔ وہ نہیں جانتا کیوں ؟ مگر اس کی محبت کی یاد کا ننھا سا دیا ہمیشہ اس کے دل کے نہاں خانہ میں روشن رہے گا ۔ اور اس کے تاریک گوشوں کو منور کرتا رہے گا !

" وہ اپنی اس پہلی ۔ اور آخری ۔ محبت کی روشنی میں اپنی پوری زندگی

خوشی کے ساتھ بتا دے گا! اور کون جانے ــــ جمیا کے دل میں بھی ان پر خلوص اور سچی محبّت کی یاد کانٹا بن کر نہ کھٹکتی رہے گی؟

ایک الم ناک حسرت کے باوجود کانتا اب روح کو پیاسا محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک عالم ہے اسی رنگ میں

توبہ ہے — جانے کس بُری گھڑی آج وُہ گھر سے چلی تھی۔ کیا خبر تھی کہ آج کا دن ہے ہی منحوس۔ نہیں تو وُہ گھر سے قدم بھی نہ نکالتی۔ امّاں نے کتنا منع کیا کہ اس وقت چاندنی چوک نہ جا نہ جا۔ شام ہونے آئی۔ واپسی میں رات ہوجائے گی۔ شریف لڑکیاں یوں اکیلی ماری ماری نہیں پھرا کرتیں۔ مگر اس نے ان کی ایک بات نہ مانی اور اُلٹی ان کی ہنسی اڑانے لگی "امّی جی آپ بھی بس — سو برس اُدھر کی باتیں کرتی ہیں۔ بھلا دن دیہاڑے ڈر کاہے کا ہے؟"

"اری کمبختی ماری آتے آتے دن دیہاڑے نہیں رہے گا، رات ہوجائے گی! شام ہی سے سناٹا ہوجاوے ہے۔ اس نگوڑی نئی دہلی میں تو۔"

"تو ہم تو امّی جی بس چھ ساڑھے چھ بجے تک گھر واپس آجائیں گے۔ آخر موہنی بھی تو ہی ہے میرے ساتھ اس کی ماتاجی تو نہیں ڈرتی ہیں۔ آپ بیچاری ٹھہریں پردہ دار —"

"چل بیٹھ پرے۔ آئی بڑی بے پردہ فیشن والی — انگریز کی دادی۔ ارے تجھ جیسی لڑکیوں سے تو میں پردہ دار کہیں زیادہ بہادر ہوں۔ ذرا سی بات ہیں تو ڈر کے مارے دم نکل جاوے ہے۔ رات کو ذرا سا کھٹکا ہُوا اور صاحبزادی میری جان پر نازل ہوئیں اور اس وقت کیسی بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہے جیسے رستم ہی تو ہے۔"

"امّاں جی خواہ مخواہ بھی۔"

"خواہ مخواہ کیا۔ یوں کہہ کہ ساڑھیوں اور چپلوں اور دو نگوڑے بروچ اور ٹاپس کے لئے جان پر بنی ہوئی ہے۔ اے توبہ یہ آج کل کی لڑکیاں۔ کپڑے جوتے ہیں جان اٹکی رہے ہے۔ بس فیشن ہو۔"

امّاں کو سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ مگر بات تھی سچی۔ پرسوں کالج کھل رہا تھا اُسے داخلہ لینے جانا تھا اور نہ اب تک اس کے نئے چپل آئے تھے۔ نہ ساڑھی ہی خریدی گئی تھی۔ کم سے کم آدمی پہلے دن تو ڈھنگ کے کپڑے پہن کے کالج جائے، جو ذرا رعب پڑے۔ یہ نہیں کہ دیکھتے ہی لڑکیاں اور استانیاں سمجھ جائیں کہ غریب گھر کی لڑکی ہے۔ فیس معاف کرا کے پڑھ رہی ہوگی۔ وہ تو وہ نوکر چاکر تک حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ تبھی تو اس نے چھٹیوں بھر جیب خرچ میں سے پیسے بچا بچا کر عیدی کے روپے سینت سینت کر اور ابا جی اور خالد بھائی کے سوئٹر بُن بُن کر تھوڑے سے روپے جوڑے تھے کہ

کالج میں داخل ہونے سے پہلے کچھ عزت والی چیزیں خریدے اور اماں کو سارا خوف آج ہی سوار ہونا تھا۔" کچھ نہیں وہ چاہتی ہی نہیں کہ میں کچھ خرید کر لاؤں۔ عزت سے رہوں۔ انھیں میری عزت کا ذرا سا بھی تو خیال نہیں ان کا بس چلے تو کالج میں داخل نہ ہونے دیں وہ تو کہو بچارے ابا جی بڑے اچھے ہیں میرے۔ وہ روہانسی ہو گئی۔

"اچھا اچھا نہیں جاؤں گی ــــ اللہ کرے مرجاؤں میں تو۔"

"نہ جاوے گی تو کون میری سات پشت پہ احسان کرے گی خود ہی تو روز اخباروں میں سے خبریں پڑھ کر سنایا کرے ہے کہ آج کل یہاں غنڈہ گردی کا بڑا زور ہے۔ فلاں پکڑا گیا۔ فلاں جیل گیا۔ یوں غنڈے شہر تو شہر نئی دہلی تک میں اکیلی لڑکیوں کو چھیڑ رہے ہیں۔"

"ارے امی جی پیاری وہ تو بہت پہلے کی بات ہے اب تو ہماری سرکار جو ہے نا۔ اس نے بہت سے پولیس کے آدمی سفید کپڑوں میں جگہ جگہ تعینات کر دیئے ہیں، بس جہاں کسی اندھے نے کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھائی اور انھوں نے بس یوں ـــــ یوں کھٹ سے اس کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔" اس نے کچھ اس انداز سے آنکھیں نکالنے کی ایکٹنگ کی کہ امی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"اری تو آج ٹھہر ہی جانا۔ کل میں خالد کو بلا کر کہہ دوں گی وہ تیرے ساتھ بازار چلا جائے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گی خالد بھائی کے ساتھ۔ رستے بھر ستاتیں گے ہر چیز میں عیب نکالیں گے۔ بڑے آئے یوسف ثانی کہیں کے۔"

بظاہر پہلے اور دوسرے جملے میں کوئی ربط نہیں تھا۔ لیکن نزہت کو خالد کے دو فقرے یاد آ گئے تھے جو وہ اس کے کالے رنگ اور چپٹی ناک پر ہمیشہ کستا رہتا تھا۔ اُسے دیکھا نہیں اور ایک آدھ فقرہ جڑ دیا۔ مانا کہ وہ بھی اس کو کم نہیں ستاتی تھی۔ بعض وقت تو رولا رُلا کر کے چھوڑ دیتی تھی۔ مگر۔ مگر۔۔۔

"خیر خیر۔ میں نہیں جاؤں گی۔ خالد بھائی کے ساتھ۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نہ جا۔ بھاڑ میں جا۔ وہ کون تڑپ رہا ہے تجھے ساتھ لیجانے کو۔ وہ خود نہیں تھوکتا تجھ پر۔" اماں نے حسب عادت اپنی فصاحت کا مظاہرہ کیا۔

"اور میں کب ان پہ تھوکتی ہوں" نزہت سچ مچ رونے لگی۔

"ارے کیا بات ہے ــــ کیوں ماں بیٹی میں جھک جھک ہو رہی ہے۔" ابّا نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"جھک جھک کرے میری جوتی۔ میں چھوٹوں کے منہ نہیں لگتی۔ یہی تمہاری لاڈلی بکواس کر رہی ہے۔"

امّاں کی تو عادت ٹھہری ہر بات کا الاپا دوسرے کے سر ڈال دینے کی۔

"کیوں بیٹی کیا ہوا۔ کیوں میری بٹیا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں؟"

ابا جی کو اپنی اکلوتی بچی سے بڑی محبت تھی۔

"ابا جی دیکھئے۔ میں ذرا موہنی کے ساتھ چاندنی چوک جا رہی تھی۔ پرسوں کالج کھل رہا ہے نا ___" اس نے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔

اور بنّو کو بناؤ سنگار کا سامان خریدنا ہے۔ کالج جانے کے لئے امّاں نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں تو کیا حرج ہے کیوں نہ خریدے۔ جاؤ بیٹی" ابا نے جھٹ اجازت دیدی۔

"چاہے کوئی رستہ سے پکڑ کرلے جائے" امّاں نے جل کر کہا غصّہ میں انھیں کبھی یہ خیال نہیں آتا تھا۔ کیا بات کہنی چاہیئے کیا نہیں۔

"خدا نہ کرے۔ کیا بکتی ہو جی۔ ارے بیٹی میں بھی تو ادھر ہی جا رہا ہوں چلو تم بھی میرے ساتھ چلی چلو۔" ابا جی نے جیسے بھولی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ابا۔ میرے پیارے ابا جی۔ آپ ذرا دس منٹ رکئے میں ابھی موہنی کو بلا کر لاتی ہوں۔"

"دیکھو کہے دیتی ہوں واپس بھی اپنے ساتھ لے کر آنا۔" امّاں نے اپنی شکست پر کھسیا کر کہا۔

"ہاں ہاں میں ہی لیتا آؤں گا۔ بیٹا تم یہ کرنا کہ اپنی شاپنگ کرنے کے بعد پرانے قلعے کے سامنے کے بس اسٹاپ کے پاس آکر کھڑی ہو جانا۔ بس

کوئی سات بجے تک میں اپنا کام کر کے واپس آؤں گا۔ تو تمھیں دونوں کو وہیں سے بٹھالوں گا۔" اچھا؟"

"جی اچھا" کہتی ہوئی نزہت پنجوں کے بل اچکتی، کودتی، گنگناتی موہنی کے گھر کی طرف دوڑ گئی۔ کہنے کو وہ سولہ سترہ سالہ نوجوان لڑکی تھی مگر کچھ اماں ابا کی لاڈلی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے کچھ اپنے کھلنڈرے مزاج کے سبب اب تک بچوں کی سی حرکتیں کرتی تھی جس پر سب خوب ہنستے اور خوش ہوتے اور خالد اسے بالکل اسی انداز سے چھیڑتا اور ستاتا۔ جیسے اپنی پانچ سالہ بہن مونا کو۔

ابا جی تو انھیں بازار کے نکڑ پر چھوڑ کر آگے چل دیئے اور یہ دونوں سہیلیاں دکان در دکان اپنی چیزوں کی تلاش میں پھرنے لگیں۔ ہر ہر دکان پر ساڑھیاں، بلاؤز کے ٹکڑے، قمیصوں کے کپڑے، جوتے، چوٹیاں، برش، کانٹے، چوڑیاں، کلپ، الا بلا ہر قسم کا سامان دیکھتی قیمت پوچھتی، کم خریدتی زیادہ جرح کرتی۔ جیب میں پیسے تھے کم اور دل میں امنگیں تھیں زیادہ، اس لئے دل کی پیاس نظروں سے بجھاتی، للچاتی۔ جانے کتنا وقت تباہ ڈالا۔ ایک بارگی نزہت چونک پڑی" اری موہنی۔ غضب ہوگیا۔ رات ہوئی جا رہی ہے ابا جی انتظار کر کے چلے نہ گئے ہوں" مگر گھڑی دونوں میں سے کسی کے پاس بھی نہ تھی۔ اس لئے دل کو یہ سمجھا لیا کہ ابھی سات نہ بجے ہوں گے۔

اور پھر باقی چیزیں خریدنے میں لگ گئیں۔

جب وہ بس اسٹاپ کے پاس پہنچی تو آٹھ بج رہے تھے۔ ابا جی کا آس پاس کہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ اماں کے ڈر سے نزہت کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ مگر موہنی نے سمجھایا کہ ارے کاہے کو ڈر رہی ہے ابھی بس آتی ہوگی دونوں اس میں بیٹھ کر چلیں گے۔ میں ماسی جی سے کہہ دوں گی کہ قصور میرا ہے نزہت کا نہیں۔

ذرا دیر گزری تھی کہ ان کے پاس آکر سلیٹی رنگ کی ایک کار رُکی۔ اس میں موہنی کے چاچا جی بیٹھے تھے۔ انھوں نے موہنی سے کہا تیری چاچی یاد کر رہی ہے، میرے ساتھ چل وہ ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔ اس نے نزہت سے بھی بہت کہا تو بھی میرے ساتھ چل۔ میں چاچا جی کے نوکر کے ساتھ گھر بھجوا دوں گی۔ مگر نزہت نے نہ مانا۔ اُسے بہت سخت غصّہ آرہا تھا اپنی دیر پہ ابا جی کی جلدبازی پر موہنی کی بے وفائی پہ اور بس پر۔ اس نے مُنہ پھلا لیا "میں نہیں جاتی۔ تم جاؤ۔ میرا بھی اللہ مالک ہے" دو چار بار موہنی نے خوشامد کی پھر وہ بھی چڑ گئی، نہیں جاتی تو نہ جا۔ میرا کیا حرج ہے۔ مگر جب کار روانہ ہونے لگی تو پھر اس نے ایک بار مڑ کر اصرار کیا "اری پگلی آجا" نزہت نے منہ موڑ لیا اور کار چل دی۔

کئی منٹ یہاں کھڑے گزر گئے مگر اس کے گھر کی طرف جانے والی بس

کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ایک بڈھا دیہاتی کچھ دور پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر نزہت کے پاس آیا۔

"کہاں جاوے گی بیٹی؟"

"کہیں نہیں"

"اری واہ ــ کہیں کیسے نہیں جاوے گی۔ آخر اس کے تو گھر سے اکیلی کیوں نکلی ہے۔ یہ زمانہ یوں اکیلے وکیلے گھومنے کا نہیں۔ معلوم تو شریف گھر کی دے ہے"۔

نزہت کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

"اری بیٹی بولے کیوں نا؟" اس کے لہجے میں خلوص اور ہمدردی تھی ــ نزہت کو کہتے ہی بنا۔ "بڑے میاں میرے اباجی اپنے ایک دوست کے ہاں گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ ان کے انتظار میں کھڑی ہوں"۔

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ اب تو آسمان پر شفق کی سرخی بھی سیاہی میں بدل گئی تھی۔ سڑکوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور ٹریفک کچھ اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جب کسی کار کی تیز روشنی نزہت کی آنکھوں پر پڑتی تو وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی۔ "یا اللہ کیا مصیبت ہے۔ کیا آج بس کمبخت مر گئی۔ اتنے میں سامنے سے بس آتی دکھائی دی اس نے زور زور سے ہاتھ ہلایا مگر وہ پہلے ہی سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اکیلی لڑکی ہے

تیزی سے بس لئے گزر گیا۔

"لے — یہ بس بھی چلی گئی — اب دوسری تو آدھ گھنٹے بعد آوے گی۔ تو یہاں اکیلی کیسے کھڑی رہوے گی۔ ادھر بڑے بدمعاش گنڈے پھرں ہیں اری بیٹری تو میرے ساتھ چل — صبح کو میں تیرے گھر پہنچا دوں گا۔ ابھی چلتا ہوں گھر پہ تیری ماسی — آٹے دال کی راہ دیکھ رہی ہوگی —" اس نے بڑے اطمینان سے نزہت سے اپنی بیوی کا رشتہ جوڑ لیا اور ہاتھ کی پوٹلی اُسے دکھائی۔

واہ جی واہ! بھلا نزہت کیسے بے جانے بوجھے آدمی کے گھر چلی جاوے — اور پھر اماں اور ابا جی — وہ کیا کریں گے!

بڈھا، غنڈوں، بدمعاشوں اور اکیلی اکیلی لڑکیوں کے خوفناک قصے سناتا رہا۔ نزہت خوف سے کانپی جا رہی تھی مگر بظاہر بڑی بہادر بنی اس کی باتیں سنتی رہی "اُنھو مجھے کسی کا کیا ڈر۔ میرے ابا جی بس اب آتے ہی ہوں گے موٹر لے کر" اور اس نے اپنے جی میں سوچا۔ کاش ابا کے پاس موٹر ہوتی اور وہ اس وقت زن سے میرے پاس آکر رکتی اور میں دھم سے اس میں بیٹھ کر کھٹ سے دروازہ بند کر کے — یہ جا — وہ جا — مگر آہ ے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

ایک اور بس آکر رکی — بڈھا رحم بھری نظروں سے نزہت کو دیکھتا بس میں سوار ہو گیا تو نزہت کو ایسا لگا جیسے اس کا کوئی بزرگ تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

مگر دو چار منٹ بعد تین عورتیں اس کے پاس آ کر کھڑی ہوئیں تو اس کی جان میں جان آئی۔ ان میں ایک لڑکی اس کی ہم عمر تھی۔ اس نے فوراً ہی پوچھا "بہن تم اتنی رات گئے یوں اکیلی کیسی کھڑی ہو؟" ہمدردی کا یہ جملہ سُن کر نزہت کے گالوں پر کئی آنسو ڈھلک آئے مگر اُس نے اپنی آواز سنبھال کر کہا "میرے ابا جی مجھے لینے آئے تھے مگر مجھے شاپنگ میں دیر ہو گئی ــــ اب گھنٹہ بھر سے یہاں کھڑی ہوں۔ بس کمبخت اب تک نہیں ملی۔"

"تم ہمارے گھر چلو ــ بہن ــــ بس دو اسٹاپ بعد ہمارا گھر ہے۔ صبح کو اپنے گھر چلی جانا۔ میں یہاں کالج میں بی اے میں پڑھتی ہوں کیا تم بھی وہیں پڑھتی ہو ــ!

بس اسٹاپ پر تنہا کھڑی نزہت کو زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ گھر ــــ خواہ وہ اس کے گھر کا سا چھوٹا سا، بے آرام، آسائش اور سجاوٹ سے بے نیاز گھر ہی کیوں نہ ہو۔ کتنی بڑی نعمت، کتنی بڑی دولت، کیسی محفوظ پناہ گاہ ہے ــــ گھر ــــ گھر جو اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی کتنا دور ہے۔ جیسے ہزاروں کوس پر ہو ــــ کیا وہ اس اجنبی ہمدرد کی دعوت قبول کر لے اور اس کے ساتھ چلی جائے۔ یہ دعوت اس وقت جنّت کی بشارت سے کم نہ تھی۔ مگر ــــ مگر گھر نہ پہونچی تو ابا اور امّی کا جانے کیا حال ہو جائے۔ رات بھر میں تو ان پر قیامت گزر جائے گی اور صبح کو اماں تو کچّا کھا جائیں گی کہ رات کو کسی کے گھر

کیوں رہی خالد بھائی تک کے گھر تو وہ رہنے نہیں دیتیں۔

"بہن تمہارا شکریہ - میری بس اب آتی ہی ہوگی"۔ اتنے میں ایک تانگہ گزرا اور تینوں عورتیں اس میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ نزہت نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ ادھر لان پہ جو آدمی بیٹھے ہیں ان میں ابا جی بھی ہوں - وہ دھیرے دھیرے ان سب کے پاس سے ٹہلتی اور غور سے دیکھتی دوبارہ بس اسٹاپ کی طرف آنے لگی اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا - ابا جی وہاں نہیں تھے!

اُسے محسوس ہُوا کہ دو آدمی اس کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں - اس نے مڑ کر نہیں دیکھا - دل زور زور سے دھڑک رہا تھا - مگر وُہ اپنا خوف ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی -

"یار ــــ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے"۔ ایک لچک دار زنانی سی آواز گا کر شعر پڑھتی سنائی دی - اور لوہے کے نوک دار برمے کی طرح نزہت کے کان کو پار کر کے دماغ میں گھس گئی -

"اوہ - اوہ - یہ نخرے ــــ یہ شان ــــ اس صورت پر ـــ" دوسری آواز کرخت بھدی، گھناؤنی اور مکروہ تھی -

بس اسٹاپ کے قریب کے کھمبے کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ دو مرد اس کے داہنے بائیں کھڑے ہیں - ایک کی بڑی بڑی خوفناک مونچھیں تھیں پان کھائے، بال بنائے، ہاتھ میں پھولوں کا گجرا لئے وُہ پورا روایتی غنڈہ نظر

آ رہا ہے۔ دوسرا نوجوان کسی کالج کا طالب علم سا نظر آتا ہے۔ عورتوں کی طرح اہتمام سے بال بنائے، نازک اندام، سجا بنا۔

نزہت کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہونٹ خشک تھے۔ گلے میں کوئی چیز پھنس گئی تھی۔ وہ ساری خوفناک خبریں، ہولناک قصے اور اصلی اور فرضی داستانیں جو اُس نے آج تک پڑھی یا سنی تھیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ کاش وہ اس بُڈھے ہمدرد کے ساتھ چلی گئی ہوتی — کاش وہ اس لڑکی ہی کے گھر چلی جاتی۔ اِدھر اُدھر کھڑے دونوں غنڈوں کے بے ہودہ فقرے پگھلے سیسے کی طرح کانوں میں گھسے جا رہے تھے۔

"یار جوتے تو بڑے زور کے ہیں —"

"بس جوتے ہی جوتے ہیں۔ باقی تو—"

"اُونھ۔ اُونھ — اسی صورت پر یہ نخرے۔"

"انکھیاں ملا کے — جیا برما کے —"

"ہم سے کھُل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم ....."

سامنے سے ایک رکشا ٹیکسی آتی نظر آئی جس کی تیز روشنی میں نزہت کو ان دونوں کے چہرے شیطان اور عفریت سے زیادہ ہولناک اور گھناؤنے محسوس ہوئے — اس سے گھر میں ہمیشہ سب نے یہی کہا تھا کہ اکیلی ٹیکسی میں کبھی نہ بیٹھنا — اُسے خود بھی ان سے بڑا ڈر لگتا ہے — مگر جیسے ہی وہ ٹیکسی

آ کر رکی اور ڈرائیور نے اس سے پوچھا کہاں جانا ہے تو اُسے کوئی بات بھی یاد نہ رہی ـــــ ان شیطانوں سے مفر کی بس یہی صورت ہے کہ وہ اس ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی جائے ـــــ نزہت ایک کہ اس میں سوار ہو گئی دو عورتیں اور ایک مرد اوساس میں بیٹھے تھے! نزہت کو ذرا ڈھارس بندھی اور اس نے ڈرائیور کو اپنی گھر کی سڑک کا نام بتایا۔ جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اس کے کان میں آواز پڑی " ہائے ہائے "۔

" ہاتھ آئی چڑیا اڑ گئی ـــــ چلے نہیں جانا ـــــ چلے نہیں جانا "

نزہت نے اپنے دھڑکتے دل کو ایک ہاتھ سے تھام کر پاس بیٹھی عورت سے پوچھا " بہن جی کہاں جاؤ گی " اور جب اس نے اس کے گھر کے قریب ہی کی سڑک کا نام لیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اور ذرا سا سکون محسوس ہوتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہنے لگا۔

چند منٹ میں دونوں عورتیں اتر گئیں۔ اب صرف ڈرائیور اور ایک اور مرد ٹیکسی میں باقی رہ گیا تھا، ذرا دیر تو وہ یہی سمجھی کہ گاڑی اس کے گھر کی طرف جارہی ہے۔ مگر اچانک اُسے احساس ہُوا کہ یہ تو کوئی دوسرا اور سنسان رستہ ہے۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی کچھ کھسر پھسر بھی کر رہے تھے۔ اور بار بار مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تھے۔ کچھ ادھورے سے جملے ـــ ٹوٹے پھوٹے فقرے اس کے کان میں پڑے۔

"چھوڑ بھی .... کیا دھرا ہے ..... پہنچا دے"۔

"اکیلی ــــ رات ــــ" پولیس ــــ" "مارو گولی ــ"

نزہت ایک الھڑ معصوم دوشیزہ تھی جس کے ہاں لڑکیوں کو زندگی کے رازوں سے بے خبر رکھا جانا شرافت کی پہچان سمجھا جاتا تھا ــــ وہ صرف اتنا سمجھتی تھی کہ بدمعاش غنڈے قسم کے لوگ عورتوں کے لئے خوفناک ہوتے ہیں اور ان سے بچنا چاہیئے۔ اور یہ احساس تھا کہ ہر لڑکی کے پاس ایک انمول گوہر ہوتا ہے جو ایک بار لٹ جائے تو پھر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور آج اسے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ یہ گوہر گراں مایہ عورت کو کتنا عزیز ہوتا ہے جس کی حفاظت کے لئے اُسے اپنی جان کنکر پتھر سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

"ارے ــ کہاں جا رہا ہے ــــ یہ رستہ نہیں ہے"۔

ایک گھناؤنی ہنسی کی آواز کے ساتھ جواب ملا "یہی رستہ ہے ــ مری جان!"

نزہت نے دیکھا کہ سڑک پر دو تین آدمی جا رہے ہیں ــ بس یہی موقع ہے ــ اتر جانے کا "گاڑی روکو ــــ روکو گاڑی ــــ میں یہاں اُتروں گی"۔

"ارے یہاں کہاں اترو گی ــــ تمہاری منزل دور ہے ــ بہت دُور"

"بکواس مت کرــ گاڑی روک ــــ ورنہ میں کود پڑوں گی"۔

"اے ہے۔ ایسا غضب نہ کرنا جانی —— نہیں تو ہم مر جائیں گے۔"

یہ کہہ کر ڈرائیور نے گاڑی کچھ اور تیز کر دی —— ایک آدمی نے ہاتھ ہلایا۔ گاڑی رکوانے کے لئے مگر اس نے روکی نہیں۔

نزہت نے آج زندگی میں پہلی بار سچے دل سے اپنے معبود کو پکارا یوں وہ کہنے کو نماز روز ہی پڑھا کرتی تھی —— مگر بس وہ تو ایک فرض تھا کہ ادا ہو جاتا تھا "یا اللہ میں نے تو اپنے کو بس تیرے سپرد کر دیا ہے"۔ اُسے ڈھنگ سے دعا بھی تو مانگنی نہیں آتی تھی "اب تو مجھے اس منحوس سے بچا لے" —— اور اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ ایک غیر مرئی ہاتھ اس کو ڈھارس دینے کے لئے اس کے دل پر رکھا ہے اور کوئی غیر محسوس ہستی اس سے بہت۔ بہت ہی قریب ہے —— اس نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا —— اور بھاگتی ٹیکسی سے "یا اللہ —— امّاں جی ——" کہتی کود پڑی۔

نزہت کے ابا بڑی دیر بس اسٹاپ پر انتظار کر کے اور یہ سمجھ کر لڑکیاں پہلے ہی گھر چلی گئی ہوں گی۔ اکیلے گھر پہنچے تو ان کی بیوی نے ان کو اس قدر آڑے ہاتھوں لیا کہ آئے حواس غائب ہو گئے۔ مہ جبیں کے گھر پچھوایا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی نہیں آئی —— خالد کو بلایا گیا —— اور ساری رات ابا اور خالد دلّی کے سڑکیں ناپتے اور خاک چھانتے پھرے اور گھر پر امّاں نے رو رو کر آنکھیں سجا

لیں پیٹ پیٹ کر منہ اور سینہ نیلا کر لیا۔ صبح نو بجے جا کر آخر یہ پتہ چلا کہ نزہت ہسپتال میں زخمی پڑی ہے۔

امّاں ابّا اور خالد اسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل ہوئے۔ ابّا جی کا چہرہ ساری رات کی دوڑ دھوپ اور پریشانی سے بالکل سیاہ ہو رہا تھا! امّاں کا مُنہ سوج کر کپّا ہو گیا تھا! اور خالد کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ ماتھے پہ شکنیں پڑی تھیں تینوں کے دل دھڑک رہے تھے ـــ جانے نزہت کو کس حال میں دیکھیں گے؟

نزہت اسپتال کے ایک بڈ پر پڑی تھی۔ ٹانگ کی ٹوٹی ہڈی جوڑ دی گئی تھی۔ زخمی سر پہ پٹی بندھی تھی۔ صرف اس کی نرگسی آنکھیں، چپٹی ناک اور ہونٹ نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پہ ایک دلآویز پرسکون تبسم کھیل رہا تھا۔ خالد دروازہ پہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ابّا شدتِ غم سے لڑکھڑا گئے۔ مُنہ سے ایک لفظ نہ نکال سکے۔ البتہ آنسوؤں کی لڑیاں ان کی سفید داڑھی کو تر بتر کر رہی تھی۔ امّاں نے اپنی بچّی کو اس حال میں دیکھا تو چیخ کر اس کی طرف دوڑیں "میری بچّی میری لاڈلی ـــ تیرے صدقے جاؤں۔ ہائے مجھ نصیبوں جلی نے کتنا منع کیا تھا نہ ماننا تھا نہ مانا ـــ باوا بیٹی دونوں ضدّی"۔ اس شدتِ غم میں بھی وہ اپنی زبان سے مجبور تھیں۔ ابّا نے بیٹی پر جھک کر بہت آہستہ سے پکارا "بیٹی ـــ بیٹیا آنکھیں کھولو"۔ اور خالد یوں ہی پتھر کی مورت بنا دروازہ پہ کھڑا

نزہت کو دیکھ رہا تھا۔

بہت مشکل سے، بہت آہستہ سے نزہت نے آنکھیں کھولیں "امی جی، ابا جی خالد بھائی"۔ بہ مشکل بس وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہائے میری بچی — سارا بدن چور ہو کر رہ گیا — یا اللہ یہ ہوا کیا — اری بتا تو کیا ہوا تھا"۔ امی کی ہچکیاں اور بین ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بڑی ہی دلفریب مسکراہٹ نزہت کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

امی جی روئیے نہیں — خدا کا شکر کیجئے — ہڈیاں ٹوٹ گئیں بلا سے — مگر خدا نے مجھے شیطان کے پنجے سے بچا لیا"۔

اور خالد نے آج پہلی بار اس کالی، کم رو چپٹی لڑکی میں حسن کی بے پناہ کشش محسوس کی۔ وہ دل کش مسکراہٹ جس میں — اس کی سیرت کا سارا حسن سمٹ آیا تھا۔ ساری دنیا کے حُسن پاکیزہ تبسم پر نثار — محبت کی پہلی بجلی دل کے ساتھ آنکھوں میں تڑپ۔ اس نے نزہت سے جھک کر آہستہ سے کہا۔ "نزہت — نزہت! اور دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو محبت کی بجلی کا کرنٹ نزہت کی آنکھوں کے رستے اس کے دل تک پہنچ گیا — زخموں سے چور چور، تکلیف سے بے حال نزہت اپنا سارا دُکھ درد بھول گئی۔ مسرت کی جو بارش اس وقت اس کے چہرے پر ہو رہی تھی وہ ابا اور امی نے کبھی بھی نہ دیکھی تھی" — آج اُسے وہ دولت حاصل تھی! جس کا اس نے پہلے کبھی خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

ہمدرد

ملکہ تو خیر یہی سمجھتی تھی کہ ایسا کون سا فرق ہے اس میں اور رانی میں۔ مگر احمد اس سے متفق نہ تھا "حالت تو ہم دونوں کی ایک سی ہے" وہ کچھ مسکرا کر جواب دیتی جس میں تلخی اور احساسِ شکست دونوں کا لگاؤ ہوتا تھا۔ احمد کی دسیوں دلیلیں بھی اس کو قائل نہ کر سکتیں۔ وہ سوچتی ؛ نام تو ہم دونوں کے ہیں ملکہ اور رانی ..... اور حالت ؛ واہ کیا رانی اور ملکہ راج کرتی ہے۔ ملکہ معظمہ کا شوہر دفتر میں کلرک ہے، دن بھر فائلوں پہ جھکا کام میں جتا رہتا ہے۔ افسروں کی دھونس سہتا ہے۔ دس اچھی بری باتیں سنتا ہے۔ تب کہیں جا کر مہینے کے شروع میں ڈیڑھ سو روپلی کے درشن ہوتے ہیں۔ جو تین بچوں میاں بیوی بہن بھائی اور باپ نو دس آدمیوں میں ہیٹی ہو جاتے ہیں .... مہینے کے آخیر میں کبھی کبھی تو خالی دال روٹی کی ہی نوبت آجاتی ہے۔ بچوں کا پاؤ بھر دودھ تک بند کر دینا پڑتا ہے۔ پھر بھی اگلا مہینہ شروع ہونے سے پہلے قرض ہو جانا لازمی ہے رانی کا پتی بھی اسی دفتر

میں چپراسی ہے دن بھر دفتر میں ایک ٹانگ سے کھڑا رہتا ہے، یا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑتے اور سائیکل پر بھاگتے گزارتا ہے۔ شام کو افسر کے بچّوں کو سیر کرواتا ہے۔ "میم صاحبان" کے کام کرتا ہے۔ تب کہیں چالیس روپئے پلّے پڑتے ہیں۔ اس پر چار بچّوں کا میاں بیوی اور اندھی ماں کا خرچہ۔ بے شک تھوڑا سا طبقاتی فرق ہم دونوں میں ضرور ہے۔ مگر سچ پوچھو تو دیکھنے بھر کا۔ بس اتنا کہ مجھے میرے میاں اور بچّوں کو پیٹ کاٹ کر بھی سفید پوشی کا بھرم بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ اور رانی راموا اس سے بے نیاز ہیں۔ یہ مانا کہ رانی کے بچّوں کے تن پر کپڑے کے نام بس چیتھڑے ہیں چند، اور خود رانی مہینوں تک ایک ہی دھوتی لپیٹے پھرتی ہے۔ مگر بلا سے اسے میری طرح دنیا دکھاوے کے لیے تو مصیبتیں نہیں بھگتنی پڑتیں۔ تو یہ ہے یہ متوسط طبقہ .... سب سے زیادہ مصیبت تو ہم ہی لوگوں کی ہے۔ آج کل ..... ڈیڑھ سو روپے کی آمدنی میں پورے پورے کنبے پالو ...... اور روپیہ ہے کہ جیسے ہاتھ میں پھسلتا ہے۔ کبھی روپے کا بیس سیر آنے والا آٹا نگوڑا ڈیڑھ سیر کا بکنے لگا ہے۔ کپڑا ہے وہ بادامول گوشت ترکاری، گھی لکڑی، مصالحہ، دالیں، چاول، ہر چیز مہنگی — سوائے آدمیوں کی جانوں کے ہے کون سی چیز سستی؟ اور پھر چلو صرف اپنا اور بال بچّوں کا پیٹ پالنا ہو تو آدمی جیسے تیسے گزارا کر لے مگر یہ ہمارے طبقے کی دوسری مصیبتیں زندگی کو اور عذاب بنائے دیتی ہیں۔ بیاہ برات، سالگرہ،

تحفے، تحائف تقریبیں، لینا دینا، آنا جانا۔ دعوتیں۔ خیر خیرات، چندے، جلسے، ڈرامے، بچّوں کی فیس، میاں کے مطالبات۔ کوئی کرے تو کیا کرے۔ بلا سے رانی کے لئے یہ مصیبت تو نہیں۔ کبھی کبھی رامو جوا ضرور کھیل لے ہے مگر روز روز تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب بچّوں ہی کا مسئلہ ہے۔ رانی کا دس برس کا لڑکا ایک جگہ اوپر کے کام پہ چھ سات روپے مہینے کا نوکر ہے۔ دوسری آٹھ سال کی بچّی کسی کا بچّہ کھلانے پہ پانچ روپے پاتی ہے۔ جب کہ خود مجھے اپنے بڑے بچّوں کی فیس، کاغذ کتاب قلم دوات اور اسکول کے کپڑوں پہ کچھ نہیں تو پندرہ بیس روپے مہینہ تو خرچ کرہی دینا پڑتا ہے ..... رانی کے بچّے بیمار پڑتے ہیں تو بچارے بغیر دوا ہی کے لوٹ پوٹ کر اچھّے ہو جاتے ہیں اور ہمارا کوئی بچّہ بیمار ہو تو دن بھر میں پانچ سات روپے ضروری ہی خرچ ہو جاتے ہیں اور بیماریاں —— جانے کیا بات ہے .... کیوں اتنی سستی ہوگئی ہیں کبھی کبھی تو اسے یہ خیال آتا ہے کہ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ بھی رانی کی طرح نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تو یہ ہزاروں سفید پوشی، شرافت اور بڑے نام کی مصیبتیں تو نہ بھگتنی پڑتیں۔ وہ بھی کہیں نوکری کر لیتی۔ بچّے بھی نوکر ہو جاتے۔ ہر وقت کی یہ سوہان روح فکریں کہ کیسے پورا پڑے؟ کیسے بھرم قائم رہے یہ تو نہ ہوتیں۔

یا اللہ.... کبھی بھی زندگی میں ان سے پیچھا چھوٹے گا؟ اس کا نا شکی اور باغی دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا وہ رانی سے کچھ زیادہ بہتر حالت میں ہے۔

دراصل وہ بہت حساس تھی ۔ اپنی تکلیف بھی اسے پریشان کردیتی تھی اور دوسروں کے لئے بھی اس کا دل کڑھا کرتا تھا، تبھی تو جب ایک دن رانی نے اس سے اپنی مشکلیں بیان کیں اور دبی زبان سے کہا "بی بی ___ تمہیں نوکرانی کی ضرورت ہو تو مجھی کو رکھ لو ...... جو چاہے دے دینا ___" تو ملکہ اس سے انکار نہ کرسکی ۔ یوں بھی وہ ہر وقت گھر کی چکّی پیستے پیستے تھک چکی تھی ۔ کھانا پکانا، بچّوں کا گھر کا کام، صفائی، سینا پرونا ۔ کوئی کہاں تک ہڈّیاں پیتا رہے ۔ میاں بھی دیکھ رہا تھا کہ ملکہ اس ہر وقت کے کاموں سے گھبرائی اور مرجھائی رہتی ہے ۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اچھا ہے رانی کو رکھ لو تمہارا ہاتھ بٹائے گی ۔ دس روپے مہینہ دے دیا کرنا ۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا ۔ مگر اس دس روپے کی کمی کا گھر کے بجٹ پر کیا اثر پڑے گا ۔ یہ دونوں ہی جانتے تھے مگر بات یہ طے ہے کہ بے نوکر کے بھی تو بھرم بنا نہیں رہتا نا ۔

رانی اور ملکہ میں دھیرے دھیرے انجانے بھی دوستی ہوگئی ۔ دونوں اپنے اپنے کام کرتی رہتیں اور باتیں ہوتی رہتیں ۔ دونوں کے بچّے ادھر اُدھر کھیلتے رہتے ۔ کبھی کبھی ماؤں کی مسلسل باتوں پر جھنجلا اٹھتے اور راکھی گلا پھاڑنا شروع کر دیتی ۔ للّو ماں ماں کی رٹ لگا دیتا اور ملکہ کا منّا بھی ماں کو اپنی جگہ رانی سے متوجّہ پاکر ضد کرنے پر اتر آتا ۔ ادھر بڑے بچّے پر اپنے لاتعداد سوالات سے پریشان کرنے لگتے ۔ مائیں کبھی ان کی باتوں پہ

چڑھ جاتیں کبھی مسکرا اٹھتیں ..... کبھی ڈانٹ دیتیں ..... کبھی دونوں اپنے اپنے چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھا لیتیں ..... رانی بے تکلف پھٹے بلاؤز کو ذرا سا اٹھا کر راکھی کے مونہہ میں دودھ دیتی اور اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ اپنے سانولے گٹھے جسم کی نمائش کر رہی ہے۔ لیکن اس سے ملکہ دوپٹہ خوب تان کر منے کے سر کو اس خیمے کے اندر کر کے اس کی طلب پوری کرتی تھی۔ اور جیسے ہی دونوں بچے اپنی بھوک مٹانا شروع کرتے ماؤں کے دلوں کے اندر کچھ عجیب شیریں سا احساس ابھرنے لگتا۔ دونوں مسکرا کر ایک دوسری کو دیکھتیں اور پھر باتیں شروع کر دیتیں۔ بچوں کی پیدائش بیماری اور شرارتوں کی باتیں شوہروں کی پہلے کی محبت اور اب ناز برداری کرانے کی باتیں۔ ہمسایوں کی بے اصولی اور بد دماغی کی باتیں اور پھر مہنگائی، گھر کی مشکلوں آمدنی اور خرچ کے فرق کی باتیں۔ ملکہ زیادہ بولتی تھی مگر رانی کی آنکھیں اور چہرہ اس سے زیادہ بولتا ہوا تھا۔ طبیعت کچھ دونوں کی ایک دوسری سے ملتی جلتی تھی ..... مسائل بھی ایک ہی سے تھے اور مشکلیں بھی۔ سسرال کی دونوں شاکی تھیں اپنے اپنے میاں کو دونوں چاہتی تھیں۔ شوہر دونوں پر دونوں بری طرح فدا تھیں۔ مگر اتنی دوستی اور بے تکلفی کے باوجود وہ یہ نہ بھول سکتیں کہ ان میں آقا اور نوکر کا رشتہ ہے۔ دونوں ہی کو اس کا احساس تھا۔ ایک کے دل میں چھپا ہوا احساس برتری اور دوسری کے دل

میں گھٹتا ہوا احساس کمتری موجود تھا۔ وہ یہ نہ بھول سکتی تھیں کہ ایک کا شوہر شریف ہے ـــــ بابو ہے۔ مالک اور دوسری کا غریب ادنیٰ درجہ کا چپراسی۔ ایک کے کپڑے سستے سہی مگر صاف ہیں۔ اور دوسری کے میلے چکٹ جن میں بو آتی ہے۔ ایک کے بچّے اسکول میں پڑھتے ہیں اور دوسری کے ننھے معصوم اس کم سنی میں نوکری کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ایک کے سر میں جوئیں ہیں دوسری کے بال بڑے اہتمام سے بنے ہوئے ہیں۔ ایک کے ہونٹوں پر صرف پان سرخی ہے اور دوسری کے لبوں پر سستی لپ اسٹک کی لالی۔ رانی قسمت کی قائل تھی۔ بھگوان نے بڑے چھوٹے بنائے ہیں یہ مفلسی اور مصیبت مزدور اس کے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے۔ اور جب وہ اپنے سے مقابلہ کرتی تو اسے ملکہ سچ مچ ملکہ ہی معلوم ہوتی۔ جس کو دونوں وقت کھانے کو ملتا ہے ..... رہنے کو اچھا خاصا گھر ہے۔ جبکہ وہ اور اس کا سارا خاندان ایک گھٹریا میں گزر کرتا ہے۔ پہننے کو صاف ستھرے کپڑے ہیں۔ بچوّں کے لئے اسکول کی تعلیم ہے، بیمار ہوں تو دوا علاج ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نعمتیں رانی اور اس کے بال بچوّں کو نصیب ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر سورگ کا بھی وہ تصوّر نہ کر سکتی تھی جب ملکہ اس سے اپنی مشکلیں بیان کرتی۔ مہنگائی کا رونا روتی تو وہ حیرت سے اس کا مونہہ دیکھنے لگتی..... اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی بی بی گلہ ہی کرتی رہتی ہے۔ کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ

آئی تھی۔

ادھر ملکہ جو پہلے اپنی مصروفیت اور محنت پر نازاں رہتی تھی اور قسمت کی شاکی، اب رانی کو دیکھ کر اس میں ایک تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ محنت کرنا کسے کہتے ہیں اور کٹھنائی کس چیز کا نام ہے یہ اور بات ہے کہ وہ ان احساسات کا ذکر احمد کے سامنے تو کیا کرتی اپنے دل میں بھی اعتراف کرنے سے جھجکتی تھی مگر جب وہ یہ دیکھتی کہ رانی کے پیٹ میں بچہ ہے اور جب کہ بھوک کم بخت اس عالم میں دوگنی ہو جاتی ہے تو دودھ پھل کا کیا ذکر اُسے دو وقت روٹی بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتی تو اس کا دل لرز اٹھتا اور ساتھ ہی وہ شکر کرتی کہ خدا نے اُسے کم سے کم پیٹ بھر کر کھانے کو دیا ہے۔ اور پھر رانی کی مشقت اور ملکہ کی محنت کا مقابلہ ہی کیا؟ گھر بار، میاں بچے اس کے بھی ہیں مگر وہ اپنے گھر کا سارا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ملکہ کے یہاں کھانا پکاتی ہے اور دوسرے محلے والوں کے دس اور کام وہ دو چار چار پیسے کی خاطر کرتی رہتی ہے۔ رات کو شاید چار پانچ گھنٹے سوتی ہوگی۔ مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی نہ اس کی تیوری پر بل رہتے ہیں نہ زبان پر قسمت کا شکوہ اور نہ رامو کی شکایت..... ہر سال دو سال بعد ایک آدھا کچا یا پکا بچہ اس کی مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لئے آموجود ہوتا ہے۔ کوئی مر جاتا ہے۔ کوئی بچ جاتا ہے۔ چار بچوں کو رو چکی ہے اور چار موجود ہیں۔

ملکہ اپنے تین ہی سے نالاں تھی۔ اور رانی کے یہاں نواں پریٹ میں آگیا تھا
ملکہ دل ہی دل میں شکر کرتی۔ مگر وہ بے درد نہ تھی وہ، وہ رانی کی مدد کرنا
چاہتی تھی مگر ایک غریب کلرک کی بیوی کیا مدد کر سکتی ہے دوسرے غریبوں
کی؟ یہ کانٹا مستقل اس کے دل میں کھٹکا کرتا۔ حالت تو یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں
آدمی تو اس جیسے ہیں دیس میں کہ ایک کمانے والا اور آٹھ دس کھانے پہننے
تعلیم پانے والے جن کا اپنا ہی پورا نہیں ہوتا۔ تو دوسروں کے کیا کام آئیں گے؟
جب تک دیس کی معاشی حالت نہ سدھرے گی، جب تک سب بیکاروں کو
کام نہ ملے گا، جب تک بچوں کو تعلیم، بیماروں کو دوا علاج، محتاجوں ضرورتمندوں
کو ان کی حاجتیں مفت نہ ملیں گی۔ اس دیس سے غربت جہالت، بیماری
مصیبت کیسے دور ہو سکتی ہے بھلا؟ رہے پیسے والے۔ ان کا یہ حال ہے
کہ وہ "بچارے" خود اپنی نہوت اور ضرورتوں کی زیادتی اور مہنگائی" کا رونا رونے
نہیں تھکتے..... کسی کی مدد کیا کریں گے؟ جتنے پیسے کسی غریب کے بچے
کے علاج کے لئے دیں اس میں جا کر ایک دو بار پکچر نہ دیکھ لی جائے؟
حساس دل اور دردمندی دیتا ہے اللہ میاں تو ملکہ جیسے لوگوں کو جو اپنا
دل زیادہ کھاتے ہیں اور دوسروں کی مدد کم کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ملکہ کو یہ تسلی تھی۔
کہ اور کچھ نہیں تو وہ رانی کا دکھ درد تو ہمدردی سے سن لیتی ہے پھر تھوڑی
بہت مدد بھی کرتی رہتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ اسے دل ہی دل میں اپنی

"انسانی دوستی اور برابری (مساوات)" کے انمول جذبات پر فخر سا محسوس ہونے لگتا۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ اس میں اور رانی میں اتنی دوستی ہوتے ہوئے بھی ایک بُعد سا — ایک دُوری سی — کچھ غیریت سی اب تک موجود تھی۔

اور پھر ایک دن رانی کام پر نہیں آئی۔ دوسرے دن بھی ملکہ اس کا انتظار کرتی رہی جانے کیا ہوا، رانی کسی بات پر خفا تو نہیں ہوگئی؟ وہ ہے بھی تو بڑی نازک مزاج اور خوددار ..... ذرا سی بات پر چپ چاپ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتی ہے۔ اور ملکہ کو وہ بہت سے واقعات یاد آنے لگے جو رانی نے اُسے سنائے تھے۔ ایک بار صاحب خانہ نے اسے گالی دے دی تھی، رانی کا چہرہ غصہ سے عنابی ہوگیا .... اس نے مُنہ سے کچھ نہیں کہا، بس زور سے زمین پر تھوکا اور وہاں سے چلی آئی اور پھر کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھا ایک پروفیسر صاحب کے ہاں نوکر ہوئی مگر بیگم صاحب اس قدر بدگمان تھیں کہ ہر نوکر انھیں چور نظر آتا تھا۔ رانی کو بھی ایک دن چوری لگا دی۔ رانی تن بدن سے کانپنے لگی" بیگم صاحب گریب ہوں پر چور بدماس نہیں ..... لو یہ رہی تمہاری نوکری .... اپنا گھر سنبھالو۔ ہم اجت دار آدمی ہیں۔ لاکھوں روپے بھی پڑے ہوں تو نجر نہ ڈالیں"۔

اور غصہ میں بھنبھناتی رانی وہاں سے چلی آئی تھی اور آٹھ دن کی تنخواہ پر

بھی لات مار دی تھی ۔ رانی نے یہ قصّے اس قدر تفصیل سے ملکہ کو سنائے تھے کہ اسے بار بار وہم ہوتا کہ شاید کسی بچّے نے رانی کے بچّے کو کچھ کہہ دیا ہے، یا میری ہی کوئی بات بری لگ گئی ہو۔ پرسوں میں نے کہا بھی تھا ذرا باورچی خانہ صاف رکھا کرو۔

مگر دوسرے دن شام کو احمد نے بتایا کہ رانی کی چھوٹی بچّی راکھی سخت بیمار ہے ۔ جانے نمونیہ ہے یا کیا دو دن سے آنکھ نہیں کھولی ۔ ملکہ پریشان ہو گئی "ہے ہے پہلے ہی بچاری کے کئی بچّے مر چکے ہیں اب بھی جب وہ ذکر کرتی ان کی یاد میں چار آنسو بہا لیتی ہے ۔ ہائے وہ تو بہت چاہتی ہے راکھی کو، اور وہ نامرادی ہے بھی تو کتنی پیاری سی ۔ مینا کی طرح باتیں ملکاتی ہے ۔ یا اللہ بے چاری غریب کی بچّی کو اچھا کر دے ....."

دن بھر ملکہ کے دل میں بار بار اس کا خیال آتا رہا ۔ احمد کو بھی فکر لگی ہوئی تھی، اس نے رامو کو راضی کیا وہ بچّی کو ڈاکٹر کو لے جا کر دکھائے ۔ ڈاکٹر نے ڈبل نمونیہ تشخیص کیا اور پچاس پچپن روپے کے انجکشن اور دوائیں لکھ دیں ۔ ملکہ اور احمد نے سات آٹھ روپے رامو کو دیئے ۔ دو چار روپے اور لوگوں نے بھی دیئے مگر پچاس روپے ـــــ ؟ آسمان سے تارے توڑنا آسان مگر اتنے روپے تو وہ کسی طرح بھی فراہم نہ کر سکتا تھا۔

کئی بار ملکہ نے ارادہ کیا کہ جا کر راکھی کو دیکھ آئے ۔ مگر ایک تو کام سے

چھٹی نہیں ملتی تھی۔ پھر منجھلی بچی کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں اور منے کے دانت نکل رہے تھے۔ دونوں سست تھے۔ وہ جائے اور خدا نہ کرے .... کہیں ان کو بیماری لگ جائے تو دل میں چھپا ہُوا خیال بار بار اس کے ارادے متزلزل کر دیتا۔

اور تیسرے دن راکھی ماں کے دل میں پانچواں زخم ڈال کر بھگوان کے پاس سدھار گئی اور ماں اور باپ دونوں کے دل پر بچی کے جدائی کے داغ کے ساتھ ساتھ یہ کسک بھی چھوڑ گئی کہ اگر ہم پچاس روپے فراہم کر سکتے، اگر ہم اس کا ٹھیک علاج کر سکتے...... اگر..... اگر..... اور یہ اگر ایک زہریلے نشتر کی طرح ان کے زخم کو چھیڑتا رہتا تھا۔

تین دن بعد رانی کام پر واپس آئی تو آدھی نہیں رہی تھی! وہ چپ چاپ چوکھٹ پکڑے کھڑی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ ملکہ اس کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ تسلی کے بول مُنہ سے نہ نکلے۔ ہاں آنکھوں کے آنسوؤں نے زبان کا کام کر دکھایا۔ دونوں کھڑی رو رہی تھیں کہ باہر سے لڑکھڑاتا منا اندر آگیا ..... وہ راکھی کا ہم سن تھا اور دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ ماں کی گود میں چڑھ کر پہلے اماں کے آنسو دونوں ننھے ننھے ہاتھوں سے پونچھے پھر رانی کے پاس جا کر بولا " رانی لوٹی کیوں؟ ہم مالیں گے .....؟ کسے ماریں گے؟ یہ معلوم نہ ہو سکا رانی کو؟ یا جس نے رانی

کو رلایا اسے۔ رانی چونک پڑی یہ راکھی کی آواز کہاں سے آئی؟ آنسوؤں کی چادر کی اوٹ سے منا اسے بالکل راکھی لگا...... اس نے ایک کر منے کو گود میں اٹھا لیا اور چھاتی سے لگا کر بے اختیار منہ چومنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور منا اس کے آنسو پونچھتا جاتا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا "روتی کیوں .... ہم مالیں گے ...."

ملکہ چپ چاپ کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی وہ رانی سے منے کو چھین نہ سکی۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ابھی تیرا بچہ مر چکا ہے، میرے بچہ کا منہ نہ چوم! کہیں اسے بیماری نہ لگ جائے .... کیسے ماتا کے اس مقدس جذبے کی توہین کرے۔ اور پھر یہ تو حال ہو گیا کہ منا سارے دن رانی کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اور رات کو جب وہ واپس جاتی تب بھی سوتے میں وہ لانی .... لانی .... پکارتا رہتا رانی گھر کا کام چھوڑ کر اس کے کام کرتی۔ منہ دھلاتی۔ کپڑے بدلتی گود میں لئے لئے پھرتی! ملکہ بار بار جھنجھلا جاتی ...... رانی تم منے کی عادتیں خراب کر رہی ہو—— رانی دیکھو بابو جی کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا اور تم نے روٹی نہیں ڈالی ...... بس ہو رہے ہیں منے کے لاڈ۔ چھوڑ دو اسے اب۔ اور رانی ہنستی ہوئی ایک بار منے کا منہ چوم کر باورچی خانے میں چلی جاتی۔ اور ملکہ کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی۔ اللہ۔ تو سب کے بچوں کو زندہ رکھ۔ کسی کی ماتا نہ اجڑے مولا—— اور وہ منے کو چھاتی سے لپٹا لیتی۔

جیسے کسی ان جانی بلا سے حفاظت کر رہی ہو اس کی۔

اور پھر اچانک احمد اور ملکہ پہ..... ایٹم بم..... گر پڑا..... رات سے منّے کا جی اتھنا سا تھا۔ صبح کو بخار تیز ہو گیا۔ شام کو ڈاکٹر نے مینجائٹس تشخیص کیا۔ چوبیس گھنٹے میں جو ہر ممکن کوشش ہو سکتی تھی ہوئی۔ باپ کی گھڑی گروی رکھ دی گئی۔ ماں کے ٹبندے بکے۔ دوستوں سے قرض لیا گیا۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر، قیمتی سے قیمتی انجکشن۔ مہنگی سے مہنگی دوا —— جو کچھ بھی کیا جا سکتا تھا کیا جانے لگا۔

اور تین دن تین رات ملکہ اور رانی نے پلک سے پلک نہیں جھپکائی جیسے وہ آدمی نہ ہوں پتّھر اور لوہے کی بنی ہوئی ہوں۔ رانی نے بچّوں کو چھوڑ دیا۔ اپنے گھر کو چھوڑ دیا۔ بس ہر وقت ملکہ کے ساتھ منّے کی تیمار داری میں مصروف رہتی اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتی "بھگوان..... منّے کو اچھا کر دے اور اس کا دل کہتا تھا کہ وہ اچھا ہو جائے گا۔ راکھی مر گئی۔ اس کے لئے کوئی دوا نہ ہو سکی تھی۔ پچاس روپے کے انجکشن نہ آ سکے تھے مگر منّا اس کے لئے سینکڑوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ بھلا وہ کیوں نہ اچھا ہوگا؟؟

اور ملکہ ایک سحر زدہ انسان کی ایک مشین کی طرح منّے کی تیمار داری کر رہی تھی۔ دل سے مسلسل ایک ہی سوال اُٹھ رہا تھا، کیا منّا اچھا ہو جائے گا؟ کیا منّا اچھا ہو جائے گا...؟ جیسے ٹوٹا ہوا ریکارڈ بار بار ایک ہی ٹکڑا بجاتا رہتا ہے وہ دعا مانگنا چاہتی مگر موہنہ سے بول نہ نکلتے —— رونا چاہتی تو آنکھ سے آنسو

نہ نکلتے۔ اور جب اس کی نظر رانی پر پڑتی جو منّے کی خدمت میں سستی ہوتی جا رہی تھی تو اس کا دل پشیمانی سے بھر جاتا" راکھی بیمار پڑی — مر گئی اور میں دیکھنے تک نہ گئی۔ اور یہ — یہ سب کچھ چھوڑ کے، اپنے بچّوں تک کو بھولے، میرے بچے کی خدمت میں دن رات ایک کئے دے رہی ہے۔ اے اللہ مجھے اس جرم کی سزا نہ دیجو۔" اس حالت میں بھی یہ خیال بار بار اس کے دل میں آتا تھا — عالی ظرف وہ ہے یا رانی؟ سچی انسان دوستی کس میں ہے؟

اور پھر اڑتالیس گھنٹے کی کرب ناک تکلیف کے بعد منّا اللہ کو پیارا ہو گیا اور اس کا سکون و شانتی بھرا چہرہ دیکھ کر ملکہ کے دل میں ایک عجیب خیال آیا۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے اس معصوم کا دکھ دور کر دیا۔" وہ خود ہی اپنے اس احساس پہ وحشت زدہ سی ہو گئی؟ اس کا لال چھِن گیا اور وہ شکر ادا کر رہی ہے۔ مگر۔ مگر اس کی تکلیف!!! آہ۔ وہ بھی تو اب برداشت نہ ہوتی تھی۔

سارا گھر عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ کچھ مسافر کے سفر کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ ملکہ کو تسلّی دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھیں کچھ اپنے مرحوم بچّوں کا تذکرہ کر رہی تھیں اور کچھ منّے کی بے وقت موت پر اظہارِ غم..... کوئی اس کی صورت کی تعریف کر رہی تھی۔ کوئی اس کی محبّت اور پیارے پن کے راگ الاپ رہی تھی..... بڑے بچّے گھبرا گھبرا کر ماں سے طرح طرح کے سوالات پوچھ رہے تھے۔ احمد دُور سے بیوی کی صورت دیکھتا اور پاس آنے کی ہمّت نہ کر پاتا لیکن ملکہ ان

سب سے بے نیاز خلا میں نظریں گاڑیں زمین پر بیٹھی تھی۔ بھیانک سناٹا خوفناک احساسِ تنہائی — سنسان دنیا۔ اجاڑ کائنات!! جب کوئی چیز اس کے سینے کے اندر پھڑپھڑائی ہے گلے میں آکر اٹکتی ہے تو ایک دو سوکھی چیخیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ اور جب اس کی نظریں اپنے حسین شاداب پھول کی طرف اٹھتیں ہیں، جواب اپنی شادابی کھوکر، مرجھا چکا تھا..... تو اس کا دامن بہتے ہوئے دودھ سے سیراب ہوجاتا۔ پینے والا اس آبِ حیات سے منہ موڑ کر چلا گیا اور چشمِ حیوان ماتا کے جوش میں بے اختیار اُبل رہا ہے۔

ملکہ کی آنکھوں میں وحشت، چہرے پر مردنی، حرکات میں جنوں کے سے آثار نظر آرہے تھے۔ اسے ہر طرف ویرانی اور تنہائی کا شدید احساس تھا جیسے یہ سب انسان نہ ہوں۔ مٹی کی مورتیاں ہوں بے حس بے درد۔ جو اس کا دکھ نہیں سمجھتیں جو اس آگ سے بے خبر ہیں جو اس کے سینے میں بھڑک رہی ہے۔

عورتوں میں سے کسی نے کہا اے ہے، رانی بچاری کو اب خبر ہوئی۔ رات دو بجے تو یہ اپنے گھر گئی تھی ہی۔ بڑا چاہتی تھی منے کو، ملکہ نے زانو سے سر اٹھایا۔ رانی اس کے برابر زمین پہ بیٹھی تھی۔ سارا جسم شدتِ گریہ سے ہل رہا تھا۔ آنسوؤں کی لڑیاں گالوں پہ سے بہہ بہہ کر مٹی میں جذب ہو رہی تھیں۔

"رانی تیرا مُنّا میری راکھی کے پاس چلا گیا۔" کچھ ایسے دھیمے درد دلدوز انداز میں یہ چند ٹوٹے پھوٹے لفظ ملکہ کے مُنہ سے نکلے جیسے کسی نے نازک سے ساز پر کوئی درد بھرا گیت دھیرے سے چھیڑ دیا ہو۔

اور دو تہی آغوش مائیں تڑپ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں — چار آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلی۔ بُعد، دوری، کمتری، برتری، بڑے، چھوٹے، امیر، غریب ہر فرق مٹ چکا تھا۔ موت کے دروازے پر پہنچ کر ہر تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ دو دُکھیا مائیں — ایک دوسری کا دُکھ پوری طرح محسوس کرنے والی بہنیں، سچی شریک غم۔ ایک دوسری سے لپٹی آنسو بہا رہی تھیں اب تنہائی نہ تھی! سنّاٹا نہ تھا — کرب ناک اذیت نہ تھی۔ ویرانی نہ تھی۔ دُکھ تھا، غم فراق بھی تھا۔ مامتا کی ہوک بھی سینوں میں سوراخ کر رہی تھی مگر سچا ہمدرد پا کر وہ اس عظیم غم کو سہارنے کا حوصلہ پا گئی تھی۔

اور آج وہ سچ مچ ایک دوسری کی بہنیں تھیں — دوست تھیں۔ گہری پر خلوص محبت کا ایک ہی چشمہ دو دلوں میں اُبل رہا تھا۔

اور ننھے معصوم راہی کے ہونٹوں پر فرشتوں کی سی مقدس مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے مقدر کی کامیابی پر خوش ہو رہا ہو۔